قیمت ۱۲؍ مطبع انوار احمدی، الہ آباد،

عہد جدید کی فارسی کتب قواعد میں مولوی محی الدین جعفری مرحوم کی کتاب مفتاح القواعد بہت زیادہ مقبول مفید اور پسندیدہ تھی، چنانچہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیون نے اسے اسکولون اور بعض جگہ کالجو تک مین داخل نصاب کردیا تھا، اور تقریباً ربع صدی سے زیادہ وہ اکیلی حکمران رہی، اب جبکہ متعدد کتابین اسی قسم کی عالم وجود مین آچکی ہین تو مولوی جلال الدین صاحب جعفری نے ان تمام کتابون کو سامنے رکھ کر اور مفتاح القواعد کو اصل شے قرار دیکر اس کی تمام کمیون کو پورا کرتے ہوئے اسے داخل نصاب مفصل اور زیادہ مفید اور کارآمد بنا دیا ہے، چنانچہ مصباح القواعد ضخامت مین مفتاح القواعد سے کئی گنا زیادہ ہے اس کے علاوہ اس کی قیمت دوسری کتابون سے کم ہے، اور امید کہ مفتاح القواعد کی طرح یہ بھی مقبول ہو گی،

پردہ پر ایک نظر، از مولوی اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی ص ۴۸ قیمت ۳؍ پتہ:۔ مدینہ بک ایجنسی بجنور،

پردۂ نسوان کا مسئلہ آج کل بہت عام ہو رہا ہے، اور مولوی صاحب نے اسی مسئلہ پر اپنے مذہبی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، اس موضوع پر جو مختلف بلکہ متضاد خیالات لوگون مین موجود ہین، ان کے لحاظ سے سنجیدہ اور سلجھے ہوئے رسالہ کا مطالعہ مفید ثابت ہو گا،

واقعاتِ عالم، مرتبہ جناب خطیب محمد عبد الرشید صاحب نمبر ۶۹، گوڈون اسٹریٹ، مدراس، صفحہ ۱۴۴ قیمت ۸؍

جناب حاجی خطیب قادر بادشاہ صاحب جنوبی ہند کے باثر کثیر التصانیف بزرگ تھے، ان کو تاریخ گوئی مین خاص ملکہ تھا چنانچہ زیر تنقید کتاب اسی قسم کی تاریخون کا مجموعہ ہے، جو گذشتہ چالیس سال کے اہم واقعات کے لیے ایک دلچسپ تاریخی چیز ہے، شروع میں مصنف کی تصویر اور مرتب کا دیباچہ بھی ہے،

"ن"

جلد بست وسوم ۲۳	ماہ شوال المکرم ۱۳۴۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۲۹ء	عدد ۴

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۲۴۲-۲۴۵
مولنا سید برکات احمد صاحب ٹونکی،	جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۲۴۶-۲۶۴
فلسفہ کب معرض وجود مین آیا؟	جناب مولوی سید ابوالقاسم صاحب سرور حیدرآباد دکن	۲۶۵-۲۷۸
آل بویہ کی ابتدائی تاریخ کے ماخذ	جناب ڈاکٹر سعید حسن صاحب ایم اے علیگ پی ایچ ڈی لنڈن،	۲۷۹-۲۸۵
ابن رشیق صقلیہ میں،	مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین،	۲۸۶-۲۹۴
حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری اور علم حدیث،	جناب مولانا شاہ نجم الدین صاحب خانقاہ بہار شریف	۲۹۵-۹۹
مریخ اور اسکی آبادی،	.	۳۰۰-۳۰۲
انگریزی کا ضخیم و مستند ترین لغت،	"ن"	۳۰۳-۳۰۵
اخبار علمیہ	"	۳۰۶-۳۰۹
تابش سہیل	مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی علیگ	۳۱۰
فیہ ما فیہ	"ع"	۳۱۱-۳۱۴
ذکری	"	۳۱۵-۳۱۷
مطبوعات جدیدہ	"ن"	۳۱۸-۳۲۰

شذرات

قسطنطنیہ کی مجلسِ نشر و تالیف نے سیرۃ نبوی کی تینوں جلدوں کے ترکی ترجمہ کے بعد اسی "سلسلۂ عصرِ سعادت" میں ہماری سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ترجمہ شائع کیا ہے، اور اس کے بعد صدرِ اسلام کا سلسلہ شروع کیا ہے جس میں خلفائے راشدینؓ کے سوانح تین حصوں میں شائع کئے ہیں، ابھی اسی سلسلہ میں الفاروق کے ترکی ترجمہ کا دوسرا اڈیشن چھپا ہے، اس کا پہلا اڈیشن آج سے دو ڈھائی برس پیشتر چھپا تھا، اس قلیل عرصہ میں اس کا دوسرا اڈیشن چھپنا اسکی مقبولیت کی بیّن دلیل ہے، ان میں سے ہر سلسلہ کے آخر میں ترک علماء اور اہلِ قلم نے سیرۃ النبی پر جو تقریظیں اور تبصرے لکھے ہیں وہ چھاپے گئے ہیں، مترجم صاحب نے اپنے نوازش نامہ میں لکھا ہے کہ ترک علماء اور عام شائقین نے اس سلسلہ کو جس قدر پسند کیا وہ توقع سے بہت زیادہ ہے،

ان کتابوں کی اصل اردو ہے، اور یہ تمامتر دار المصنفین کی تصنیفات ہیں، مگر ان ترکی ترجموں کی ان "سست عقیدہ اور بے دین" ترکوں نے جو قدر دانی کی، کیا ہندوستان کے پختہ عقیدہ اور دیندار مسلمانوں نے کی، سیر الصحابہ کا یہ سلسلہ جو حقیقت میں اسلام کا زندہ اور عملی مرقع ہے، اور جس کے آئینہ میں مسلمانوں کو اگلے اسلام کی صورت نظر آسکتی ہے، اسکی قدر اسی قدر ہوئی ہے، کہ دو تین برس کے عرصہ میں اسکی ایک ہزار جلد بھی نکل نہ سکی، اشتہار پر اشتہار دیئے، اخبارات نے ہمت افزا تبصرے لکھے، علماء نے پسندیدگی کی سندیں عطا کیں، مگر خریداری کے رجسٹر میں خریداروں کے نام توقع سے بہت کم نظر آتے ہیں، کیا اسی اعتماد پر کام کرنے والے اپنے کام کو جاری رکھ سکتے ہیں، اور اردو کی خدمت کا تہیہ کر سکتے ہیں؛

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں مذہبی کتابوں کی طرف توجہ زیادہ ہے، مگر دار المصنفین نے خالص علمی، خالص ادبی، خالص تاریخی، خالص فلسفیانہ، خالص مذہبی، ہر قسم کی کتابیں شائع کیں، مگر ہر شعبۂ علم و فن کی اوسط یکساں ہی رہی، اور اس پر بھی بعض مشہور تاجرینِ کتب کا بیان یہ ہے کہ تمام اردو مطبوعات میں دار المصنفین کی کتابیں زیادہ بکتی ہیں، لیکن اگر ہم دار المصنفین کی مطبوعات کی اشاعت سے دوسری اردو کتابوں کی اشاعت کی میزان لگائیں تو نتیجہ کس قدر افسوسناک برآمد ہوگا،

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمرِ نکاح کے متعلق معارف میں جو مضمون چھپا تھا، اس وقت تک اس کا جواب نہیں نکلا ہے، بہرحال یہ خاموش اعتراف بھی اس زمانہ میں بسا غنیمت ہے، لیکن اس کے بعد اس صغر سنی کی شادی کے جواز و عدم جواز کے مسئلہ پر معارف میں مولوی ریاست علی صاحب کا جو جوابی مضمون شائع ہوا تھا اس کا جواب دیا گیا ہے، اس نئے جواب کا جواب دینا اس لیے بیکار ہے کہ اس میں صرف پچھلے چبائے ہوئے نوالوں کو پھر نگل کر چبایا گیا ہے، جس کو کوئی نفاست پسند پسند نہ کریگا، ساتھ ہی کچھ اور مزید دعاوی اختراع کئے گئے ہیں، چونکہ یہ ایسا مسئلہ ہے جو حدیث و فقہ کی ہر کتاب میں تقریباً موجود ہے، اس لیے ہم ہر صاحبِ علم سے یہ درخواست کرینگے کہ زید و عمر کی نسبت کو چھوڑ کر وہ دونوں طرف کے مضامین کے حوالوں کو ملا کر خود دیکھ لیں، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے شہر کے کسی عالمِ دین سے دریافت کر لیں، ان پر حق منکشف ہو جائیگا، اور پتہ لگ جائیگا کہ کون اسلام اور شریعتِ اسلام پر افترا کر رہا ہے، وکفیٰ بہ مبینا

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا مسئلہ ایک مدت سے زیرِ بحث تھا، بحمد اللہ کہ فروری کے اوائل میں کورٹ کے پورے ایوان نے متفقہ آواز سے اس کا جو فیصلہ کیا، اس نے نہ صرف علی گڈھ بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی تسلی اور سکون کی فضا پیدا کر دی، سید راس مسعود کا انتخاب اس وقت بہترین انتخاب تھا، روایتی اور خاندانی اثرات کو چھوڑ کر ہم نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جو نئی تعلیم یافتہ جماعت میں شرقیت کا بہترین حامل ہے، جس کو ایک بڑی اسلامی

سلطنت کے تعلیمی انتظام کا عملی تجربہ ہے، جس کو یورپ اور مشرق کے بہترین تعلیمی نظامات کے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، اور جس کو "لبرل" اور "کنسرویٹو" دونوں جماعتوں میں اعتبار حاصل ہے، ہم کو پوری توقع ہے کہ یہ انتخاب یونیورسٹی کی بہت سی بیماریوں کا کامیاب علاج ثابت ہوگا،

ع۔ سالے کہ نکوست از بہارش پیداست، ہم کو یونیورسٹی میں جس نایاب عنصر کی تلاش ہے وہ ایثار ہے، ہم کو خوشی ہے کہ سید راس مسعود نے یونیورسٹی کے لوگوں کو سب سے پہلے اسی کا سبق دیا، سب کو معلوم ہے کہ عین اس وقت جب قوم نے ان کے سامنے وائس چانسلری کا آنریری عہدہ پیش کیا، ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست نے ان سے ایک ہزار ر کے پنشن کے علاوہ دو ہزار ماہوار کے ایک ممتاز عہدہ کے قبول کرنے کی خواہش کی، مگر انھوں نے پورے ایثار کے ساتھ قوم کی بے دام اور بے مزد نوکری کو ایک ریاست عظمیٰ کے اعلیٰ ترین منصب اور گرانقدر معاوضہ کے مقابلہ میں قبول کر لیا، یونیورسٹی کی سرنو تعمیر میں اسی قسم کی مثالوں اور نظیروں کی ضرورت ہے،

ہم کو اس انتخاب سے جو سب سے بڑی توقع ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ سید راس مسعود پر تقریباً ملک کے ہر طبقہ کو یکساں بھروسہ ہے، اور خود علی گڑھ کے تعلیم یافتوں میں موالات و ترک موالات کے سبب سے نااتفاقی کی جو خلیج حائل ہو گئی ہے، سید راس مسعود کے آجانے سے وہ پوری طرح پٹ جائے گی، اور یہ علی گڑھ کے معاملات کی درستی کی راہ میں بہت بڑی کامیابی ہے،

ملک کے تمام لوگوں نے اس خبر کو افسوس کے ساتھ سنا ہوگا کہ مولانا محمد علی نے اپنا روزانہ اخبار ہمدرد اس بنا پر بند کر دیا کہ اس کے خریداروں کی تعداد اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ اخبار کی اشاعت کا بار اٹھا سکتی، مولانا محمد علی کے مشرب اور مسلک سے جس کسی کو بھی جس قدر بھی اختلاف ہو تاہم اس اظہار میں باک نہیں کہ ہمدرد تنہا اردو کا روزنامہ تھا جس کا اصول عوام پرستی کے سیلاب میں بہنا نہیں بلکہ

اپنے مسلک پر عوام کو چلانا تھا، وہ تفریح و قہقہہ کا اخبار نہ تھا بلکہ عوام اور ارباب دونوں کو سیاسی مسائل کا سکھانے والا نصاب درس تھا، اس میں خبریں تبلیغ و پروپیگنڈے اور خریداری بڑھانے کے اصول پر نہیں شائع ہوتی تھیں بلکہ ملک کو حقیقت اور واقعیت سے باخبر رکھنے کے لیے، اس کے مضامین صرف دور از کار انشا پردازی، اور بے معنی لفاظی سے پاک ہوتے تھے، اس کے مقالے معلومات سے لبریز، دلائل سے معمور اور سنجیدگی و متانت کے معیار پر پورے ہوتے تھے، بازاری نقاد و ظرافت، عامیانہ پھکڑ اور بے سلیقہ الفاظ سے وہ پاک ہوتا تھا، اس کی ناکامی نے یہ افسوسناک حقیقت ثابت کر دی کہ مسلمان ابتک سنجیدگی، متانت اور باوقار لٹریچر کی قدردانی کے لیے تیار نہیں،

اخبارات میں ایک بحث علمائے خیر اور علمائے سو کی شناخت اور امتیاز کی چھڑی ہے، لیکن اس سے پہلے کہ ظاہری شناخت اور امتیاز کی بحث پیدا ہو، ضرورت اس کی ہے کہ معنوی شناخت اور امتیاز کی ہو کہ علمائے خیر کون ہیں اور علمائے سو کس کو کہتے ہیں، ایک صاحب کے نزدیک علمائے خیر وہ ہیں جو نہرو رپورٹ کی تائید کریں اور اس کے مخالف علمائے سو، ایک اور صاحب غرض کی رائے میں علمائے خیر وہ ہیں جو کسی مدعی اسلام کو خواہ کسی قدر کفریات اور بدعات کا مرتکب ہو کافر یا فاسق یا گمراہ نہ کہتے ہوں، اور جو ایسا کہیں وہ علمائے سو ہیں، کسی کے نزدیک امیر امان اللہ خاں کی مخالفت و موافقت ان دونوں فرقوں کی معنوی پہچان ہے، کسی آزاد خیال کا خیال ہے کہ جو مذہبیات اور دینیات کی تحریف و نسخ کو جائز رکھے وہ جماعت علمائے خیر میں ہے ورنہ گروہ اشرار میں، کوئی صاحب کہتے ہیں کہ ملک کی آزادی کا اس اسکیم کے مطابق جو اس کے ذہن میں ہے جو موافق ہو وہ عالم خیر ہے ورنہ عالم سو، تو جن جماعتوں کی معنوی شناخت اور امتیاز میں اسقدر اختلافات ہیں ان کی ظاہری شناخت و امتیاز کی دعوت کسقدر سطحی بات ہے،

آج ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر جو بڑے سے بڑے ملکی آزادی اور وطنی تحریک کے علمبردار ہوں، اور انھوں نے اس راہ میں جو کمالات دکھائے ہوں ہمارا دعویٰ ہے کہ علماء کی جماعت نے کسی منزل میں ان سے کم اپنی آزادی اور حریت کے دلائل پیش نہیں کیے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے لیکر آج تک اس راستہ کی کونسی منزل ہے جس میں وہ مدعیان آزادی سے علماء پیچھے رہے ہیں، سیاسی خائن، وطنی غدار، اور آزادی کے دشمن جس کثرت سے ان ارباب عمائم اور اصحاب ریش میں نظر آتے ہیں، فرنگی طبعی آئینہ تمثال بخشانوں والے بلکہ بے ریش و بروت پیران نابالغ میں ان سے کم نہیں، پھر یہ ان کے ناز و تبختر کی کیا چیز ہے؟ اور ان کے اس فخر و غرور کی کیا بنیاد ہے؟ بقول سعدی

درویش صفت باش کلاہ تتری دار

مگر آج کے سعدی درویش صفتی کے جویاں نہیں، صرف کلاہ تتری کے طالب ہیں، قول بلا عمل جس طرح مذہب میں ہیچ ہے سیاست میں بھی بیکار ہے،

مقالات

حضرت حکیم سید برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ

از

جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(۴)

حدیث نبوی کی جستجو رامپور کا دور جس وقت ختم ہوا، تو اس وقت حضرت کو تنبیہ ہوئی، کہ ذہنی محامل کا تو ذخیرہ فراہم ہو گیا، لیکن لاہوتی معارف کا کوئی حصہ ہاتھ نہیں آیا، اب نبوت کی روشنی میں جو علم پیدا ہوا تھا، اس کی تلاش پیدا ہوئی، آپ کے ساتھ مولانا ماجد علی سابق صدر مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ بھی عقلیات کے درس سے فارغ ہوئے تھے، دونوں کی جیبی ایک تھی، یہ دونوں حدیث پڑھنا چاہتے تھے، لیکن یہاں ایک سخت پیچیدہ سوال تھا،

عموماً اس زمانہ میں ہندوستان کے علم حدیث کی درس وافادہ کی ریاست یا تو شمس العلماء میاں نذیر حسین صاحب دہلوی مرحوم پر ختم ہوتی تھی، اور چونکہ میاں صاحبؒ بھی وطناً بہاری تھے، اس لیے طبعاً حضرت کا رجحان اسی طرف ہونا چاہیے تھا، لیکن مصیبت یہ تھی، کہ میاں صاحب اہل الحدیث والالفاظ تھے، اور یہاں الفاظ حدیث کے ساتھ ساتھ معانی وحقائق کا بھی مطالبہ تھا جس کی توقع دہلی کے درس میں بہت کم تھی، یا کم از کم حضرت الاستاذ کا یہی خیال تھا، میاں صاحب مرحوم کے سوا حنفی علماء میں اس فن کے اس زمانہ میں مرجع الکل، رحلۃ الطلبہ کل دو حضرات تھے، ایک مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ ناشر ومحشی بخاری، اور دوسرے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تھے،

الفاظ نہیں، بلکہ معانی آثار وحدیث کے طلبہ، یا یوں کہئے کہ حلقہ بگوشان امام الائمہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

زیادہ تر ان ہی دو محدثوں میں سے کسی ایک کے پاس اس فن کی تکمیل وتحصیل کے لیے حاضر ہوتے تھے، لیکن بدقسمتی سے ان دونوں حضرات کا تعلق بھی جماعت علمائے دیوبند سے تھا جس سے خیرآبادی درس کے اہل علم کی معاصرانہ چشمک مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کے زمانہ سے جاری تھی، یہ دونوں حضرات احیائے اسلام میں تھے، دین کے دونوں فدائی سبیل اللہ کے مجاہد تھے، اور اسی ملی اور دینی جوش کا وہ خونین نقارہ تھا، کہ دلّی کا علامہ نحریر پنجاب کے میدانوں میں سکھوں کی تلواروں کے نیچے خاک وخون میں تڑپ رہا تھا، لیکن اگر دلّی کا شہید مرکر اس طرح زندہ ہو رہا تھا تو کیا یہ غلط ہے، کہ خیرآباد کا علمی بھی اسلام کے عشق کا مجرم قرار پاکر، قید فرنگ کی زنجیروں کو جھنکتا ہوا، انڈمان کے ساحل سے نور کی دنیا کی طرف روانہ ہوا، ان پاک طینت عاشقوں میں لوگوں کو رقابت نظر آتی ہے، ہوسکتی ہے، مجھے کہ ان بزرگوں کو یاد کروں، اور یہ پڑھتا رہوں،

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

بایہم اقتدیتم اہتدیتم، اور اب تو دونوں کی اقتدا گمراہی قرار دی گئی،

علمائے رسوم۔ رسم کی پابندیوں پر زیادہ زور دیتے ہیں، لیکن کیا کوئی پوچھ سکتا ہے، کہ پابندی صرف مناظرہ ومجادلہ کے لئے ضروری ہے، "خاک وخوں" کی "غلطیدن" کی رسم کا زندہ کرنے والا بھی تم میں کوئی ہے؟

بہرحال دہلوی سلسلۂ علم اور خیرآبادی خاندان والوں میں ایک علمی منافرت ضرور تھی، جس کی بڑی وجہ وہی "معاصرت" ہوتی تھی، اور اب بھی ہوتی ہے، لوگ مذہب کو بدنام کرتے ہیں، حالانکہ جو مذہب نہیں رکھتے ہیں، کیا ان میں معاصرانہ منافرتوں کی کمی ہے، علم سیاست، آخر کس میدان میں، اس کے گرد غبار نہیں اڑ رہے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ لڑتا تو انسان ہے، اور بدنام ہوتا ہے مذہب، یہ دنیا کی بڑی بڑی لڑائیوں کو نہیں سوچتے، عظیم مکاریوں پر غور نہیں کرتے، تو کیا ان کے سامنے امیر وداغ کی منافرت، انیس ودبیر کی باہمی رقابت، شبلی کے مداحوں اور حالی کے بادخواہوں کی منافسہ بھی نہیں ہے؟ کیا ان میں بھی غریب مذہب کی دراندازی

ہوئی ہے، جن جذبات پران منافرتوں کی بنیاد ہے، اس کے استعمال پذیر ہونے کے لیے صرف انسان ہونا شرط ہے، انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں اس تصادم سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جس میں ایک مذہب بھی ہے، مذہبی جماعت ہو یا غیر مذہبی پارٹیوں سے کیا کوئی خالی ہے؟ اور واقعہ یہ ہے، کہ دہلوی و خیرآبادی منافرت، جو بعد کو دیوبندی اور خیرآبادی منافرت سے بدل گئی، اس کا تعلق بجائے مذہب کے زیادہ تر علم سے، یا بجائے دل کے دماغ سے ہے، مذہب کا غیر ضروری دراز و دور جزئیات بعیدہ کو لیکر صرف ذہنی کرتبوں کے کمالات دکھائے گئے ہیں،

بہرحال ظاہر ہے کہ حضرت الاستاذ کی علمی تعمیر میں، بالکلیہ خیرآبادی مواد و مصالحہ خرچ ہوا تھا، ایسی صورت میں مشکل تھا، کہ آپ دیوبند کے کسی عالم کے آگے زانوے تلمذ تہ کریں، جانتے تھے، کہ علم حدیث ان ہی لوگوں کی ملکیت ہے لیکن علمی غیرت اجازت نہیں دیتی تھی، اور غیرت سے زیادہ مولانا عبدالحق خیرآبادی کی حمیت علمی کے لیے یہ واقعہ ہیجان انگیز ہوتا، حضرت کو اس کا بھی خوف تھا، نتیجہ یہ ہوا، کہ آپ کے رفیق درس مولانا ماجد علی نے تو ننگ و ناموس کو خیرآباد کہکر، ماخز نبوت کے عشق میں گنگوہ کی راہ لی، لیکن حضرت سے یہ نہ ہوسکا، تاہم

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

کے تزاحم کشاکش میں مہینوں بےچین رہے، اور آخر میں ایک غیر معروف لیکن معتبر و مستند محدث، مولانا قاضی ایوب صاحب بھلتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مولانا خیرآبادی سے اجازت لیکر حاضر ہوگئے، قاضی صاحب کا بھی نسبی اور علمی تعلق دہلوی خاندان سے تھا، لیکن دیوبندیوں کی طرح شاہ ولی اللہ کے گھرانے کی علم برداری میں خیرآباد میں وہ بدنام نہ تھے، بھوپال میں عہدۂ قضاء سے سرفراز تھے، اور ہمارے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے وہ حقیقی خالو بھی تھے،

اب رامپور کا فلسفی بھوپال میں صرف چشمۂ وحی و نبوت سے سیر ہونے میں مشغول ہوگیا، بھوپال کے یہ چند دن بھی حضرت کی زندگی میں عجیب تھے، یہ سچ ہے کہ اب بھوپال کے اس وقت تک طالب العلم

تھے، لیکن خیرآباد کے تو ایک سربرآوردہ عالم ہو چکے تھے، خود بھی پڑھانے کا شوق ابتدا سے تھا، رامپور میں بھی اگر خود بڑی کتابیں پڑھتے تھے، تو چھوٹی کتابیں دوسروں کو پڑھاتے تھے، اور قدیم نظام تعلیم جسے میں "آزاد تعلیم" کہتا ہوں، اس کی بہت سی خصوصیتوں میں ایک اہم اور مفید ترین خصوصیت یہ تھی، کہ اعلیٰ جماعت کے طلبہ ادنیٰ جماعتوں کے مدرس و معلم ہوتے تھے، اس طرح پڑھی ہوئی کتابیں، ایام تحصیل ہی میں، علماء کو مشق ہو جاتی تھیں، عموماً فراغت کے وقت یہ حال ہوتا تھا، کہ بجز اوپر کی چند کتابوں کے اکثر کتابوں کے درس سے بھی فارغ ہو چکے ہوتے تھے،

حضرت الاستاذ جب بھوپال پہنچے، تو ٹونک سے طلبہ کی بھی، ایک جماعت آپ کے ساتھ آئی، خود بھوپال میں بھی تلامذہ کی ایک جماعت آپ پر جمع ہوگئی، درس حدیث سے جو وقت بچ جاتا تھا، وہ عام درسی کتابوں کے پڑھانے میں صرف ہوتا تھا، طالب علمی کیساتھ تعلیم دینا کوئی نئی بات تو نہیں تھی، لیکن بھوپال میں حضرت نے جس قسم کا درس دیا تھا، وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے یقیناً بہت ممتاز تھا، اسی عہد طالب العلمی میں آپنے چند آدمی تیار کئے جنمیں ایک مدرسہ خلیلیہ ٹونک کے صدر مدرس مولانا نصیر احمد اور دوسرے محکمہ شرعیہ ٹونک کے مفتی مولانا خلیل الرحمن صاحب تیسرے کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر شیخ الفقہ مولانا عبدالواسع صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

اس طرح شاید ایک سال سے زیادہ زمانہ آپنے بھوپال میں گذارا تحصیل سے فراغت کے بعد آپ کی طالب العلمی کا زمانہ ختم ہوگیا، اور اب اشاعت علم، نشر معارف، تبلیغ دین کے ولولہ سے معمور ہوکر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے،

میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا، کہ کس وقت لیکن عہد تعلم کے ان ہی دنوں میں، آپنے کچھ تو اپنے والد مرحوم سے اور کچھ دہلی کے اس خاندان میں جس کے نمائندہ حکیم رضی الدین مرحوم تھے، آپ نے فن طب کی بھی تکمیل کرلی تھی، اسی طرح غالباً طالب العلمی ہی کے زمانہ میں رامپور کے ایک بزرگ صاحبدل سے آپ مرید بھی ہوگئے تھے، اور ان ہی ایام میں تنزلی زندگی کے مرحلہ ازدواج کو بھی آپ ختم کر چکے تھے، تحصیل طب و حصول بیعت کے متعلق

مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں، لیکن ایک اہم نتیجہ خیز تاریخی حقیقت کو میں قصداً چھوڑ دونگا، اگر حضرت کے نکاح اول کی بعض خصوصیات کو یہاں بیان نہ کروں،

عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حکیم دائم علی صاحب مرحوم میر نگر (صوبہ بہار) کے ایک غیر مستطیع امی خاندان کے سادات سے تعلق رکھتے تھے، ٹونک پہنچکر مفر معلق نے انکو ریاست کے جلیل عہدوں، اور رفیع مناصب تک پہنچایا، اب وہ میر نگر کے ایک مسکین سید نہیں، بلکہ ہندوستان کی ایک مشہور ریاست کے امیر کبیر تھے، کون خیال کر سکتا ہے، کہ ٹونک کے ان قصور وایوانوں میں حکیم دائم علی صاحب کے حافظہ میں میر نگر کے خس پوش و شکستہ جھونپڑیوں کے ارتسامات زندہ ہونگے،

لیکن ابراہیمؑ کو اپنے بچے اسحاقؑ کے لیے جب دولہن کی ضرورت ہوئی، تو فلسطین کے رئیس نے عراق کے دور دست علاقے سے لڑکی منگوائی، پھر دیکھو، کہ ہزار ہا سال بعد اسی ابراہیمی نسل کے ایک سردار کو راجپوتانہ کے صحرا میں اپنے لڑکے کے لیے بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، تو وہ ہزار ہا میل دور بہار کے ایک گاؤں میں اپنی بہو کو ڈھونڈھتا ہے، جہاں وہ پیدا ہوا تھا، اور جن کے نسب کی صحت پر اسے اعتماد تھا، ٹونک سے ریاست کے ایک سر برآوردہ عہدہ دار کے لڑکے کی بارات روانہ ہوئی، سنگین محلسراؤں سے روانہ ہوئی، اونچے دروازوں سے روانہ ہوئی، اور سیکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک ایسے جھونپڑے کے سامنے کھڑی ہوئی جس کے متعلق بزرگوں سے میں نے سنا تھا، کہ اس کی دیوار بھی کچی تھی، اور اس پر چھپر بھی صرف پھوس کا تھا، حکیم دائم علی صاحب نے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا نکاح بڑے ذوق شوق سے اپنے قدیم گاؤں میر نگر کے ایک غریب سید کی لڑکی سے کیا تھا، کیا اس واقعہ میں ان باطنی چشمکوں، اور اندرونی بدگمانیوں کے سکون کا کچھ سامان ڈھونڈھا جا سکتا ہے، جو ہندوستان کے سادات کے متعلق بعض ذہنوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں، آج انساب کی طہارت انسل کی سعادت کو دولت کی کالی دیوی پر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے، کیا قربانیوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری تھا، میر نگر میں ایک ہاشمی قربان کر رہا تھا، کیا دولت پر نسل کو قربان کر رہا تھا، یا دولت، عزت، شہرت بلکہ ...

سہولت، قرب مسافت میں سے ہر ایک چیز کو چن چنکر اس نے ذبح کر دیا، تاکہ اس کے نسب کی پاکی، اور خاندان کی بزرگی باقی رہے، اور ایک حکیم دائم علی صاحب مرحوم نہیں، بلکہ فاطمہؓ کے گھرانے والوں میں اس صدی سے پہلے "خون" کی تلافی، زندگی کے کسی شعبہ سے نہیں ہو سکتی تھی، پھر اگر ہندوستان کے طول و عرض میں اور اقوام کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں حسینؑ یا حسنؑ کے خاندان والے پائے جاتے تھے یا اب بھی پائے جاتے ہیں، تو دلوں میں وسوسہ کیوں پیدا ہوتا ہے، اور اب تو زمانہ نے جو کروٹ لی ہے، سونے اور چاندی کے دیوتاؤں کی پرستش کا جو زور ہو رہا ہے، افسوس ہے کہ یہ وسوسے واقعات بن رہے ہیں، اور شاید وہ تو بن بھی چکے، لیکن جہاں آج تاریکی ہے، نہ کہو کہ وہاں ہمیشہ یہی اندھیر چھایا ہوا تھا، فانا للہ وانا الیہ راجعون،

ملازمت الغرض حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے کسب کمال کا عہد بھی ختم ہو چکا، دین و دنیا کے متعلق جتنے علوم متداولہ سیکھنے تھے، سیکھ چکے، عالم ہوئے، حکیم ہوئے، مرید ہوئے، متاہل ہوئے، سب کچھ ہوئے، اب ایک مرحلہ معاش کا باقی تھا، حضرت کے ساتھ خدا ے مہربان تھا، اس نے آپ کو ایک شفیق باپ عطا فرمایا تھا، جس وقت آپ فارغ التحصیل ہو کر مراجعت فرماے ٹونک ہوے تھے، اس وقت حکیم دائم علی صاحب کی عمر گو پچاس سے متجاوز ہو چکی تھی، لیکن قوی مضبوط تھے، نواب صاحب ٹونک ان پر صرف اعتماد ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کی تقوی، اور پارسائی نے نواب میں ان کی جانب سے حسن اعتقاد بھی پیدا کر دیا تھا، وہ ان کو اپنا صرف معالج جسمانی ہی نہیں خیال کرتے تھے، بلکہ ان کی دوا سے زیادہ ان کی دعا میں اپنی صحت و تندرستی کی ضمانت محسوس کرتے تھے، مشہور ہے کہ نواب کی یہ عقیدت اس درجہ کو پہنچی ہوئی تھی، کہ طبیعت خراب ہے، حکیم دائم علیصاحب بلائے گئے ہیں، اندر باغ جہاں نواب صاحب رہتے ہیں، اس کے دروازہ پر حکیم صاحب پہنچے اور وہ اپنی بیماری میں خفت محسوس کرتے تھے،

اقتدار وجاہ، اختیارات و اعزاز کی خواہش عمومی دلوں کو مسخ کر دیتی ہے وہ اپنی آخری سانس تک اس سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے، حکیم دائم علی صاحب بھی چاہتے، تو ان کو ملازمت سے جدا کر ...

کوئی نہ تھا، لیکن باوجود شدید تعلقات کے حکیم دائم علی صاحب مرحوم اپنے عہد ملازمت میں دنیا پر خود چھائے رہے، اس کو اپنے اوپر کبھی چھانے نہ دیا، انھوں نے دیکھا، کہ اب میرا لڑکا ہر طرح سے میرے فرائض کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا کر چکا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اسی دن کے وہ منتظر تھے، سب سے پہلا کام انھوں نے یہ کیا، کہ نواب صاحب کے پاس حاضر ہوے، اور ریاست کے تمام تعلقات سے استعفا دے کر صرف اتنا عرض کیا، کہ میرے منصب طبابت پر آپ اب میرے بیٹے کو مقرر کر لیجئے، اصرار سخت تھا، نواب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا، اور یوں بغیر کسی تگ و دو کے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ تعالیٰ نے فراخی رزق کے دروازے کھولدیے، حکیم دائم علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے بھی دیکھا تھا، آخر عمر میں ان کا شغل یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم رہ گیا تھا، فرائض و مکتوبات کے سوا روزانہ مٹو کی مسجد میں سو رکعتیں نفل کی ادا کرتے، رات بھر ذکر و فکر مراقبہ و مجاہدہ میں گذارتے اور دن اللہ والوں کے خطوط، و ملفوظات، و حالات کے پڑھنے میں بسر کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ اگر کبھی شوق تھا، تو اپنے سعادتمند جوان بخت فرزند سعید کی درسگاہ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوے گذر جاتے، کون کہہ سکتا ہے، کہ اس دانشمند انسان نے دنیا اور دین کی لذتوں کا کتنا سرمایہ اپنے سینے میں جمع کر لیا تھا، اور جو فطرت کی راہ پر چلتا ہے، قدرت اس کی مسرتوں کے اضافہ میں کبھی کوئی کمی نہیں کرتی، وہ

من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا — جو میری یاد سے کترایا تو ضرور اس کے لئے گھٹی ہوئی زندگی ہے

اور

من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن — مرد عورت میں سے جس کسی نے اچھے کام کئے اور وہ ماننے والوں میں بھی ہے

فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ — تو ہم اسے جلاتے ہیں، پاکیزہ زندگی کے ساتھ،

کے اصول پر قوت کے ساتھ جمے ہوے تھے اور اس کے برکات سے دنیا میں بھی دنیا کے بعد بھی متمتع ہوتے رہے ہوتے رہیں گے۔

عام انسانوں کی زندگی کے چند ہی مراحل ہیں، خصوصاً شرفاء کے خاندانوں میں یہ سمجھا جاتا ہے، کہ لڑکا پڑھ لکھ لے، اس کی شادی ہو جاے، کہیں نوکر ہو جاے، ان مراحل کے بعد زندگی کی جدوجہد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے پہلے بھی یہی تھا اور اب تو بقول اکبر مرحوم

کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوے نوکر ہوے، پنشن ملی پھر مر گئے

سے زیادہ اپنی حیات کے سوانح کو مشکل ہی سے کوئی چھوڑتا ہے، ہزارہا انسان ہیں، جن کی زندگی کی تفسیر شعر مذکور کے مصرعہ ثانی سے زیادہ نہیں،

لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں، جنھیں قدرت اپنے لیے بناتی ہے، یا یوں کہو کہ جو کمانے کے لیے نہیں جیتے ہیں، بلکہ جینے کے لیے کماتے ہیں، جدوجہد کے جن نقاط پر عوام کی زندگی ختم ہو جاتی ہے، ان نفوس عالیہ کی زندگی ان ہی سے شروع ہوتی ہے،

دیکھو! کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ تمام شریفانہ فرائض سے فارغ ہونے کے بعد ایک والی ملک کے طبی مشیر کے عہدہ سے سرفراز ہو چکے تھے، تنخواہ معقول تھی جاگیر تھی، جائداد تھی، عزت تھی، جاہ تھا، سوا اس کے چونکہ آپ طبیب تھے تو یہ بھی ممکن تھا، کہ علاوہ تنخواہ کے اپنے قیمتی اوقات کو روپیہ بٹورنے میں صرف کر دیتے چاہتے تو شہر کے ہر گھر سے فیس اور دوا فروشی کے بہانے سے درہم و دینار کے سیلاب کو اپنے جیب میں بھر لیتے، کچھ ماحول بھی چنداں مناسب نہ تھا، آپ ایک رئیس کے لڑکے تھے، امیرانہ چاؤ ماں سے پالے گئے تھے، آپ کے احباب واقران سب کے سب دنیا پر منہ کے بل گرے ہوے تھے، ریاست کے بڑے بڑے افسر آپ کے دوست تھے، لیکن باہمہ کے ساتھ بے ہمگی کا جو ثبوت انھوں نے پیش کیا، اگر اس کو میں کسی ازلی انتخاب کا نتیجہ نہ خیال کروں تو اور کیا خیال کروں، کوئی مانع نہ تھا، اگر علاوہ طبی مشغلہ کے وہ ریاست کے کسی انتظامی، اور کشوری صیغہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیتے، خدا نے ان میں ہر قسم کی

صلاحیت پیدا کی تھی، ریاست اور رئیس پر ان کا ذاتی اور خاندانی اقتدار ہر قسم کے امکانات کے لیے زمین درست کیے ہوئے تھا،

لیکن نواب صاحب کے معالج خاص ہونے کا عہدہ انھوں نے ابتدائے عمر میں اختیار کیا، اور جب دنیا سے روانہ ہوئے، تو بجز طبیب خاص ہونے کے ان کے اسم گرامی کے پیچھے اور کوئی منصبی اور دنیاوی اعزاز شریک نہ تھا، اللہ نے ان کے سینے کو اس سے زیادہ وسیع پیدا کیا تھا، کہ وہ ان چلتی پھرتی چھاؤں کے نیچے دم لیتے، قناعت نے دل کو ٹھنڈا کر دیا، اور ہمت نے تن آسانی کے گوشۂ عافیت میں بیٹھنے نہ دیا، وہ اٹھے، اور جب تک جیتے رہے، علم اور دین کی خدمت میں اپنے کو مٹا دیا، حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا حقیقی دور یہی دور ہے، اسکی تفصیل و بسط کے لیے دفتر درکار ہے، میں اختصار کے ساتھ کلی طور پر ان کی زندگی کے اس دور کو تین حصوں پر تقسیم کر کے اپنے مضمون کو اب ختم کردنگا،

اس زندگی کا پہلا حصہ درس و افادہ تھا، دوسرے حصہ میں آپ پر تالیف و تصنیف کا ذوق غالب ہوا، اور آخر عمر میں وہ ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اس مشغلہ میں ڈوب گئے، جس میں ڈوبنے کے لیے انسان بنایا گیا ہے، ان کی عمر کل (۷۷) سال کی ہوئی، اس لیے یہ کہنا تو صحیح نہیں ہے کہ وہ یاس و نا امیدی کے سن میں پہنچکر ریاضات دینیہ، اور مجاہدات عرفانیہ میں مشغول ہوئے، کتنے غافل دل ہیں، جو اس عمر کے بعد بھی نہیں چونکتے، اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ تو سچ یہ ہے کہ بیداری کے اس جزء سے بحمد اللہ کہ اپنے ہر دور میں سرفراز تھے، لیکن جو چیز پہلے چنگاری تھی وہی آخر میں شعلۂ جوالہ بن کر ان کے خرمن حیات پر مسلط ہو گئی، شروع میں وہ مدرس تھے پھر مصنف ہوئے، اور آخر میں وہ صرف ایک صوفی صافی درویش نیک اندیش تھے، میں ترتیب کے ساتھ ان کے ہر دور کے بعض اجمالی خصوصیات کو درج کرتا ہوں،

درس و افادہ کہا جا چکا ہے کہ پڑھانے اور درس دینے کا شوق ان پر اس زمانہ میں بھی غالب تھا، جب وہ خود پڑھتے تھے، بھوپال میں طلبہ کی ایک خاصی جماعت آپ سے مستفید ہو رہی تھی، ابتداءً ان ہی طالبعلموں

میں سے کچھ لوگ آپ کے ساتھ ٹونک پہنچے، یہاں اب ایک باضابطہ درس کا آغاز شروع ہوا، لیکن اس درس کے لیے کیا آپ نے اخباروں میں چندے کی اپیل کی، مسلمانوں کے پاس آپ نے سفراء بھیجے، کانفرنس بنائی، ریزولیشن، پاس کیے، کمیٹیاں قائم کیں، نصاب بنایا، کلنڈر شائع کیے؟ کچھ نہیں، خود تھے، علم تھا، محنت تھی، اور خدا کی توفیق تھی، جو آتا گیا، اسکی کتابیں شروع کرادیگئیں، اور اس طرح اس مدرسہ یا جامعہ کی ابتداء ہو گئی، جس کے فارغین و محصلین، ہندوستان کے بڑے بڑے مدرسوں کے مدرس اور صدر مدرس ہوئے، اور صرف ہند نہیں، بلکہ جاوا، سرحد کے کوہستانوں میں، کابل کی پہاڑیوں میں بخارا کے مرغزاروں میں، کوقند خیوہ تاشقند کی مسجدوں میں، تم کو اس عجیب و غریب مدرسہ کے فارغ شدہ علماء علم و دین کی خدمت میں مصروف نظر آئیں گے،

مدرسہ خلیلیہ ابتداءً آپ کے حلقۂ درس میں ٹونک کے مقامی طلبہ اور کچھ بیرونی طلبہ شریک ہوئے، لیکن جس جانکاہی، دماغ سوزی، شفقت و مہربانی سے آپ پڑھاتے تھے، رفتہ رفتہ آپ کی درسی عظمت کا احاطہ وسیع ہونے لگا، اور نہ صرف ہندوستان، بلکہ ممالک اسلامیہ کے اقطار سے طلبہ کی جماعت آپ پر ٹوٹنے لگی، ان غریب الدیار طلبہ میں ایسے بھی ہوتے جو عربی کی ابتدائی صرف و نحو سے بھی واقف نہیں ہوتے، ایک ایسا شخص جو اسلامی علوم کے ہر شعبہ کی اعلیٰ کتابیں خود پڑھاتا ہو، مشکل تھی، کہ وہ ان بچوں کی تعلیم بھی اپنے ذمہ لے، کچھ دن تو نفس پر جبر بھی کیا، اور ایک زمانہ آپ پر ایسا بھی گذرا ہے کہ صبح پانچ بجے سے لیکر رات کے گیارہ بجے تک مسلسل سبق پڑھاتے رہتے تھے، لیکن جون جون طلبہ کی کثرت ہوتی گئی، کام کی سرانجامی میں دقت ہونے لگی، آخر اپنی معاونت کے لیے آپ نے ریاست سے محض معمولی امداد دے کر، چند مدرسین کو قلیل تنخواہوں پر نوکر رکھ لیا، اور ریاست ہی نے ایک شکستہ لیکن وسیع مکان آپ کو دیدیا، جنھیں یہ مدرسین نیچے درجہ کی جماعتوں کو پڑھایا کرتے تھے، اس مدرسہ کی مالی حیثیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے سب کے بڑے مدرس کی تنخواہ تیس روپیہ نواب شاہی (ریاست ٹونک کے سکہ) سے زائد نہ تھی، اس مدرسہ کا نام مدرسہ خلیلیہ ہے جو والی عصر کے تخلص گرامی خلیل کی طرف منسوب ہے، حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ ابتدا میں مدرسین کی ہمت افزائی کے لیے، چند اسباق خود مدرسہ میں جاکر پڑھایا کرتے

لیکن جب کام چل پڑا، تو جس مدرسہ سے سیکڑوں علماء نکلے، دنیا کو یہ سنکر حیرت ہوگی، اسکی عمارتی وسعت صرف ایک دالان تک محدود تھی، جسپر کویلو کا چھپر پڑا ہوا تھا، اور جس میں دری بھی نہیں، صرف جاجم کا فرش پڑا رہتا، اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹھنے کے لیے روئی کا چھوٹا سا گدا تھا، سامنے معمولی لکڑی کی ایک تپائی پڑی رہتی تھی، جسپر ایساغوجی سے لیکر شفار تک اور نورالانوار سے توضیح وتلویح تک، شرح وقایہ سے ہدایہ تک مشکوۃ سے بخاری تک کا وہ درس ہوتا رہا، جس کا بنگال سے لے کر بخارا تک کے علمی حلقوں میں غلغلہ بلند تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ذاتی مکان بہت وسیع تھا، اور امیرانہ تھا، لیکن وہ سب دوسروں کے لیے تھا، اپنے رہنے کیلیے آپ نے صرف ایک سائبان اور ایک حجرہ کا چھوٹا سا مکان منتخب کیا تھا، جس میں اہل وعیال کے ساتھ آپ بسر کرتے تھے، اور پڑھانے کے لیے مٹی کا ایک خام دالان آپ نے باہر ... بنوا لیا تھا، مدرسہ خلیلیہ تو صرف ایک اعانتی مدرسہ تھا، ورنہ ٹونک کی جس درسگاہ نے شہرت حاصل کی، اس کی تعمیری حیثیت کل اتنی تھی،

طلبہ کے قیام وطعام کا انتظام

درسی دور کے وسط میں حضرت کے پاس بیرونی طلبہ کا ایک بڑا گروہ جمع ہوگیا تھا، ان میں بہار، صوبجات متحدہ، پنجاب، راجپوتانہ، سرحد، کابل، بخارا، سمرقند، ترمذ، ہرات، قفقاز ہر جگہ کے طالب علم تھے، خیال کیا جاسکتا ہے کہ اتنے مختلف الطبائع نفوس یکجا ہی اجتماع کی شیرازہ بندی، اور پھر ان کے کھانے پینے کے بندوبست کے لیے کیا کچھ انتظام نہ کیا گیا ہوگا،

لیکن اسباب کو جو اپنے قابو میں لینا چاہتے ہیں، تجربہ بتاتا ہے، کہ اسباب ان کے قابو میں بہت کم آتے ہیں، یا آتے ہیں، تو مشکل سے آتے ہیں، یہ میرا چشم دید واقعہ ہے، اور برسوں دیکھتا رہا کہ ہر طرح کے طالب العلم آتے تھے، لیکن ان کے انتظام کے لیے صرف دو صورتیں تھیں،

پہلی صورت تو وہ تھی، جسے دیکھ کر میں اس وقت بھی حیرت کرتا تھا اور ابتک میرے تعجب کا ازالہ نہیں ہوا ہے، کہ طلبہ کی ایک بڑی جماعت حضرت ہی کی ذاتی مہمان تھی، یہ سچ ہے کہ حضرت کو حکومت سے تقریبًا چار سو روپیے معینہ تنخواہ میں ملتے تھے اور آپ کی جاگیر میں ایک گاؤں بھی تھا، یقینًا یہ کوئی غیر معمولی

آمدنی نہیں تھی، لیکن برسوں میں نے دیکھا، کہ بیس بیس پچیس پچیس طالب العلم کا کھانا دونوں وقت حضرت کے گھر سے پک کر، الگ خوانچوں میں طالب العلموں کے پاس آتا تھا، گھر میں بجز ایک ماما بریرہ کے مشکل سے اور کوئی عورت خادمہ رہتی تھی، لیکن میں اسے حضرت کی کرامت کہوں، یا آپ کی بیوی صاحبہ کی انتھک توجہ ومحنت کہ تازہ گرم گرم چپاتیاں، بکرے کے گوشت کا سالن، صبح آٹھ بجے تک طالب العلموں کو مل جاتا تھا، اسی طرح شام کو مغرب کی نماز پڑھکر لوگ حضرت کے دردولت پر جمع ہو جاتے تھے، اور اسی وقت شام کے کھانے سے فارغ کر دیئے جاتے تھے، ان طلبہ میں سے کچھ لوگ تو حضرت کے احباب کے مکان میں رہتے تھے، لیکن ایک خاص مجمع خود آپ کے ایک بڑے وسیع پختہ مکان میں فروکش تھا، جسے بغیا کہتے تھے، آج قومی اور ملکی خدمات کرنے والے حضرات چندوں کی بھرمار سے پبلک کو زچ کیے ہوے ہیں، لاکھوں روپیے، مختلف ناموں سے لئے جاتے ہیں، اور بہائے جاتے ہیں، میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ یہ لوگ کام نہیں کرتے، لیکن اس ایثار اس قربانی کی کوئی نظیر دنیا اب بھی پیش کر سکتی ہے، کہ صبح سے شام تک ایک شخص ہر قسم کے علوم کا درس دیتا ہے، اور کسی سے ایک حبہ نہیں لیتا، اور پھر اسی پر بس نہیں کرتا، بلکہ اپنے جیب سے ہر مہینہ میں ایک بڑی رقم طالب العلموں کے کھانے پینے پر صرف کرتا ہے، فرض کرو کہ کوئی یہ بھی کرے، لیکن کھانے کی تیاری، اور کھلانے کی ذمہ داری اپنے سر کون لینے کے لیے تیار ہے، آہ کہ قوم ملک وطن کے الفاظ سے ہماری پچھلی نسلیں اس طرح آشنا نہیں تھیں، جیسی کہ اب ہیں، لیکن ان کے حقائق ومصادیق کے ساتھ ان کے عملی کارناموں اور اولوالعزمانہ خدمتوں کو ان یحمدوا بمالم یفعلوا (تعریف کی جائے ان کاموں پر جو انھوں نے نہیں کئے ہیں) کے قرن سیاہ میں ڈھونڈھنا بھی فضول ہے، تم میں کوئی صرف تھوڑی تنخواہ لیتا ہے، یا نہیں لیتا ہے، تو اسکی مدح وستایش کے گیتوں سے گنبد گردوں میں گونج پیدا کرتے ہو، لیکن انھی قباؤں کے نیچے، جو اللہ کے دوست پوشیدہ تھے، افسوس کہ ان کو تم میں سے کسی نے نہیں پہچانا، الحاصل طالب العلموں کے ایک بڑے گروہ کے قیام اور طعام کا ایک انتظام تو یہ تھا، تھوڑے ایسے بھی تھے، جو مدرسہ خلیلیہ سے وظیفہ پاتے

اور بعض دوسرے شہروں کی طرح مساجد میں بھی رہتے تھے،

طلبہ کے ساتھ آپ کا برتاؤ

قطع نظر اس عام سلوک کے جو بیان کیا گیا، حضرت کا اپنے طلبہ کے ساتھ عام برتاؤ حاکمانہ یا مستبدانہ قطعاً نہ تھا، درس میں تو مشتغلین پر ایک قدرتی رعب چھایا رہتا تھا، بڑے بڑے مستعد اور ذکی، طالب العلموں کو سوال کی جرات کم ہوتی تھی، لیکن عام صحبتوں میں وہ ہر ایک مہربان دوست سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے تھے، غیر درسی مجلسوں میں ہر قسم کے ذکر و اذکار، بلکہ کبھی کبھی کسی طالب العلم سے ظرافت بھی فرما لیا کرتے، تواضع کا یہ حال تھا کہ اگر کسی وجہ سے کسی طالب العلم پر آپ خفا بھی ہوتے تو تھوڑی دیر بعد آپ کو منفعلانہ افسوس ہوتا، اور اسکی تلافی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرما لیتے، ایک دن کا ذکر ہے، ایک سرحدی طالب العلم تمام علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد گشت کرتا ہوا شفا، اشارات پڑھنے کے لیے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ قدآور تھا، اس لیے اس کا نام ابوالبشر رکھدیا گیا، اور اس قسم کے خطابات ظرافت میں اکثر تقسیم ہوتے تھے، پانی پت کے ایک معمر طالب العلم کا خطاب مولوی چچا صاحب تھا، بدایوں کے ایک ذہین طالب العلم مولوی عبدالواحد مرحوم تھے، چونکہ پست قد تھے، اس لیے ان کا نام ملا مختصر دیا گیا تھا، بہار کے ایک طالب العلم ذرا زیادہ بولتے تھے، آستانۂ استاد سے ان کو بالسٹر کا خطاب ملا تھا،

بہرحال مولوی ابوالبشر اپنے نام ہی کی وجہ سے محلِ طیبت بنے ہوئے تھے، ان سے اکثر چٹکیاں لیجاتی تھیں، اسی وجہ سے وہ کچھ شوخ بھی ہو گئے تھے، ایک دن درس کے وقت کچھ اس طرح الجھے کہ حضرت کا مزاج برہم ہو گیا، آپ نے غصہ میں کچھ ان کو بھی برا بھلا کہا، ساتھ ہی فرمایا کہ تم نے کس محصل سے تعلیم پائی ہے جو اتنا بھی نہیں سمجھتے، سرحدی پٹھان کو اپنے استاد کی مہملیت کی وجہ سے کچھ غصہ آگیا، اور درس سے اٹھکر وہ اپنے حجرے میں چلا آیا، اس وقت تو بات یوں ہی ہو گئی، مغرب کے بعد میں نے تاریکی میں دیکھا کہ کوئی آدمی اس کے حجرے میں داخل ہوا، اور مولوی ابوالبشر سے مراضاۃ بلکہ معافی کے کلمات کہہ رہا ہے، غور جو کیا تو وہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ تھے، اس تواضع اور انکسار پر دل نے عبرتوں کا ایک سبق حاصل کیا، رحمہ اللہ،

طریقۂ تعلیم

حضرت کا تعلیمی طریقہ زیادہ تر خیرآبادی درس کا تابع تھا جس کی بنیاد مطالعہ، تقریر، تکرار یا اعادہ پر قائم تھی، مطالعہ کا مطلب یہ تھا کہ ہر طالب العلم پر لازم تھا، کہ بغیر حواشی و شروح کی امداد کے روزانہ پڑھنے سے پیشتر اپنے سبق کے مطالب پر حاوی ہو کر درس میں آئے، اور اس کا کبھی کبھی فجائی امتحان بھی ہوتا رہتا تھا، آپ کو اس کی بھنک بھی لگ جاتی تھی کہ فلاں طالب علم حواشی اور شروح کی اعانت سے کتاب کا مطلب حل کرتا ہے تو اس پر آگ بگولہ ہو جاتے، مطالعہ صرف طالب العلم ہی پر فرض نہ تھا، بلکہ بغیر مطالعہ کے حضرت شرح تہذیب و قطبی جیسی آسان ابتدائی کتابیں مشکل ہی سے پڑھاتے، فرماتے تھے کہ بغیر دیکھے ہوئے کسی کتاب کا درس جائز نہیں ہے، کسی دن اگر آپ رات کو کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے تو نہایت صفائی سے کہدیتے کہ آج اس کا سبق نہیں ہوگا،

تقریر سے یہ غرض ہے کہ درس کے وقت کسی طالب العلم کو کتاب کی عبارت پڑھنے کا حکم ہوتا تھا، عبارت کی صحت پر خاص توجہ ہوتی تھی، وہی استاد جو درس سے پیشتر ایک معمولی دوست کی حیثیت سے ملتا تھا، عبارتی اغلاط پر اس کے چہرہ کا تکدر طلبہ کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا تھا، تنبیہاً کبھی کبھی کتاب بھی اٹھا کر پھینکدیتے تھے، جب عبارت ہو چکی، تو اس مقام کا مطلب نہایت شستہ اردو میں، آپ خود فرماتے، مطلب کی بنیاد جن مقدمات پر ہوتی ان کو پہلے بیان کرتے، پھر اصل مطلب کے بعد، جس جماعت کا طالب العلم ہوتا، اس کی وسعت کے مطابق مصنف کے کلام پر نہایت سنجیدہ تنقید فرماتے،

تکرار یا اعادہ قدیم درس کا ایک ضروری جزء تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ رسم عربی مدارس سے اٹھ رہی ہے، حضرت اس کا خاص لحاظ فرماتے تھے، ہر جماعت کے طلبہ مختلف ٹولیوں میں تقسیم ہوتے تھے، جماعت میں جو زیادہ فہمیدہ، ذکی طالب العلم ہوتا تھا، وہ اپنی ٹولی کا معید ہوتا تھا، اس کا فرض تھا کہ جو کچھ اس نے استاد سے سنا ہے، جہاں تک ممکن ہو ان ہی الفاظ میں پھر اپنی جماعت میں دہرائے، بعض طلبہ تو اس میں اسقدر غلو کرتے تھے، کہ حضرت کی طرح شکل و صورت ہیئت بھی بناتے تھے،

یہ تو عام دستور تھا، لیکن بعض خاص خاص طلبہ کے ذمہ علاوہ ان باتوں کے ایک حکم خاص یہ بھی ہوتا تھا کہ روزانہ اپنے سبق کو اردو میں لکھ لیا کریں، اور پھر وہ حضرت الاستاذ کو دکھلائیں، ان مراحل کے بعد ایک درس ختم ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ اس کے بعد طالب العلم ہر کتاب پر کس قدر حاوی ہوجاتا تھا،

حضرت کے درس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مصنفینِ کتاب کے متعلق یہ کبھی یاد نہیں کراتے تھے، کہ ان کے بیانات قطعی اور فیصلہ کن ہیں، بلکہ جہاں جہاں ان میں غلطیاں ہوتی تھیں، آزادی کے ساتھ اسے ظاہر فرماتے، خود فرماتے کہ میں کتاب نہیں پڑھانا چاہتا ہوں، فن سکھانا چاہتا ہوں،

آپ کو اس سے سخت نفرت تھی، کہ صرف طلبہ پر رعب جمانے کے لیے ان کے فہم و استعداد سے زیادہ بے محل اعلیٰ باتیں بیان کیجائیں، دوسری درسگاہوں کے آئے ہوئے طالب العلم اس کے عادی ہوتے، اور کبھی کبھی اپنی حیثیت سے زیادہ کوئی اونچی بات پوچھتے، تو ان کو جھڑک دیتے اور فرماتے کہ گدرانے سے پیشتر تم پکنے کی کیوں کوشش کرتے ہو؟

آپ نے طالب العلموں کو انتخاب علم و کتاب کے مسئلہ میں بالکل آزادی دے رکھی تھی، ہر طالب علم کو اختیار تھا کہ جو چاہے پڑھے، میں نے آپ کے یہاں ایسے طلبہ بھی دیکھے ہیں، جو صرف ایک کتاب میں شریک ہوتے تھے، لیکن ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی، ہر طالب العلم آزاد تھا، جتنی عمر تک جتنے دن تک چاہے آپ کے مدرسہ میں رہے، عجیب بات یہ تھی کہ آپکے یہاں نہ کوئی حاضری کا رجسٹر تھا، اور نہ اس پر کبھی توجہ کرتے، کہ کون طالب علم آیا ہے کون نہیں آیا ہے، لیکن اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا ہے، تو اس ہشت سالہ مدت میں میں نے کسی طالب علم کو نہیں دیکھا، کہ محض بے شوقی کی وجہ سے وہ درس سے غائب رہا ہو اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا، تو اس کی تکلیف کے لیے میں اپنے پاس الفاظ نہیں پاتا، جو یہ بیچارہ محسوس کرتا تھا، دوسرے طالب العلموں خصوصاً معیدوں سے وہ پھر اس سبق کو سنتا، اور افسوس کرتا کہ میں موجود نہ تھا،

غیر درسی مجالس میں تحصیل علم اور قیمتِ علم کے متعلق ایسے واقعات سناتے رہتے تھے، کہ خود بخود طالب العلم علم کی تشنگی سے معمور ہوجاتا تھا، آج دار الاقاموں میں مودبین ہیں، طلبہ کی صبح و شام نگرانی کیجاتی ہے لیکن جس علمی ماحول کو میں نے اس کھپریل کے بے ضابطہ مدرسہ میں پایا، پھر کہیں نہیں دیکھا، تقریروں، حاشیوں شرحوں، قلمی کتابوں کی نقل میں تنافس کا ایک عجیب خوشگوار سلسلہ جاری تھا، حتی کہ کبھی کبھی یہی شوق حد سے بڑھ جاتا تھا، ایک دفعہ فلسفہ کی ایک کتاب کی نقل کے سلسلہ میں دو طالب العلموں میں کشمکش جاری تھی اور اس کشمکش کا آخری انجام اس پر ہوا تھا، کہ دونوں کے ہاتھ میں چھری تھی، ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کی نقل کا موقعہ مجھے پہلے ملنا چاہئے، ورنہ زندگی ختم کردیجائے گی، گو یہ اپنا ایک عیب ہے، اور اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی زندہ نہیں ہیں، لیکن ایک بدقسمت طالب العلم آپ ہی کے پاس وہ بھی تھا، کہ آپ نے خوانساری کا حاشیہ شفاء، اور ملا جلال کا حاشیہ از مولانا فضل امام خیرآبادی جسے آپ کسی کو نہیں دکھاتے تھے، اور یہ بھی علم کی قدر و منزلت کا ایک غالبانہ رنگ تھا، یہ دونوں حاشیے جلد بندھوانے کے لیے اس طالب العلم پر اعتماد کرکے آپ نے دیا، حکم تھا، کہ کسی کو نہ دکھانا، اور دو دن میں جلد بندھوا کر مجھے دیدینا، لیکن جس پر اعتماد کیا گیا تھا، وہ غادر ثابت ہوا، اور دو رات دو دن مسلسل جاگ کر سیکڑوں صفحات کے ان حواشی کو نقل کرلیا، بڑی قیمت دیکر جلد بند سے چند گھنٹوں میں جلد بندھوا کر حضرت کے حوالہ کردیا، جس کی خبر غالباً حضرت کو اپنی آخری عمر تک نہیں ہوئی، وہ غالباً یہی خیال فرماتے رہے کہ اس کتاب کا کوئی نسخہ ہمارے یہاں کے سوا اور کہیں نہیں ہے، جواز و عدم جواز، غدر و خیانت سے بحث نہیں لیکن مجھے اس پر حیرت ہے کہ الٰہی وہ کیا طرز تعلیم اور اصول تربیت تھا، کہ طلبہ میں ذوقِ علم کی ایسی آگ لگی ہوئی تھی، آج کتابیں بازاروں میں ملتی ہیں، لاکھوں روپیے ہر کالج اور مدرسوں میں کتاب خانوں پر صرف کئے جاتے ہیں، لیکن کتب خانوں کی لین دین کے کھاتوں کو دیکھو! فسانوں اور ناولوں کے سوا کم کتابیں ایسی نظر آئیں گی، جنکو طلبہ مطالعہ کے لیے لیگئے ہوں،

علوم درسیہ حضرت الاستاذ خیرآبادی اسکول کے چشم و چراغ تھے، اس لیے قدرۃً آپ پر منطق، اور فلسفہ کی شاخ مابعد الطبعیات کا ذوق غالب تھا، درس میں زیادہ زور ان ہی دو علموں پر دیا جاتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ

ریاضیات کے سوا، تقریبًا ان تمام علوم متداولہ کی کتابیں پڑھاتے تھے، جو عربی مدارس کے نصاب میں شریک ہیں، میں نے حضرت کو ادب عربی کی کتب اربعہ (حریری متنبی وغیرہ) بھی پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے، ان کے سوا حدیث میں صحاح ستہ کا درس تو آپ باضابطہ دیتے تھے، فقہ میں ہدایہ اخیرین کو بڑی تدقیق اور شوق سے پڑھاتے تھے، بیضاوی کے ڈھائی پارہ میں اپنی تفسیری قوت کا بھی اظہار فرماتے تھے، عرصہ کے بعد بطور مشغلہ کے آپ دیوان حافظ، مثنوی مولانا روم، مکتوبات مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی درس دیتے تھے، اور کبھی کبھی طلبہ کے اصرار سے آپ طب بھی پڑھاتے تھے، لیکن بعض طلبہ کے لیے خصوصیت کے ساتھ حکم تھا کہ وہ طب کے درس میں شریک نہوں، ان ہی بدبختوں میں ایک وہ بھی تھا جو طب کے درس سے کئی بار اٹھایا گیا، اور یہ کہکر اٹھایا گیا کہ "تجھے پر قینچ کرکے رکھا جائے گا" اور یہ واقعہ ہے کہ وہ اس وقت تک ہر قسم کے معاشی علوم سے ناآشنا ہے، لیکن افسوس کہ جو حضرت کی تمنا تھی، وہ بھی پوری نہ کرسکا، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا،

مغرب کے بعد آپ کتابی مطب بھی بعض طلبہ کو کراتے تھے، بعض مختلف امراض کے مریض فرض کرکے نسخے بتاتے،

اردو میں فلسفہ کی تعلیم حضرت کی تعلیمی زبان اردو تھی، جیسا کہ ہندوستان کے تمام مدارس میں رواج ہے، لیکن ایک خاص خصوصیت آپ کے درس کی یہ تھی، کہ جب کسی طالب علم کو آپ ابتدا سے فلسفہ پڑھانا چاہتے تھے، تو اپنے استاد مولانا عبد الحق خیر آبادی کی ایک ابتدائی کتاب جس کا نام زبدۃ الحکمت ہے ضرور پڑھاتے تھے، اور غالبًا اردو زبان میں کسی فن کی تعلیم کی یہ ابتدا تھی، اور یوں ہی فلسفہ کی عربی کتابوں میں آپ بعض اصطلاحات کا ترجمہ مزے سے لیکر کیا کرتے تھے، مثلًا تداخل کا ترجمہ آپ "درانا" علول کا "پیوست ہونا" فرماتے، آپ کے ایسے خاص ترجموں کی فہرست بہت طویل ہے،

امتحان آپ کا درس جس طرح رجسٹروں کے گورکھ دھندوں سے آزاد تھا، اسی طرح امتحان کی جھنجھٹوں سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا، یوں پوچھو، تو ہر طالب العلم آپ کے یہاں ہر وقت زیر امتحان ہوتا تھا، عبارت خوانی

سوال و جواب سب میں اس پر کافی گرفت اور تنقید ہوتی رہتی تھی، لیکن سند فروشی کے لیے آپ نے امتحان کا کوئی باضابطہ باب اپنے درس میں نہیں رکھا تھا، زمانہ چونکہ امتحان پر زور دیتا تھا، تو کبھی کبھی سال میں ایک دفعہ زیادہ تر تقریری اور کبھی کبھی تحریری امتحان لے لیا کرتے تھے، لیکن اسکی اہمیت ان کی نگاہ میں صرف اس قدر تھی، کہ طالب العلموں کو ہفتوں پہلے خود ہی سوالات بتا دیتے تھے، کہ "یہ باتیں تم سے پوچھی جائینگی" جب امتحان لے لیتے، اور طالب العلم کتاب کا لکھا ہوا جواب دے چکتا، تو فرماتے، کہ یہ تو کتاب کی بات ہے، یا تم نے مجھ سے سنی ہیں، میں حافظہ کا امتحان لینا نہیں چاہتا، بلکہ تمھاری استعداد و فہم کا امتحان لونگا، اب اس جواب کے متعلق کوئی پیچیدہ سوال خود پیدا کرکے پوچھتے کہ اس کا کیا جواب ہے؟ جو طالب العلم اس جدید سوال کا جواب دیتا تھا، وہی پاس سمجھا جاتا، ورنہ ناکام اس کے ساتھ ساتھ ہر طالب العلم کی حیثیت، استعداد پر گہری نظر رکھتے، اس کی جو کمزوریاں ہوتیں، دفع فرماتے، بعض خاص طالب العلموں کے اولیا کو آپ ہر سال ان کے بچے کی تعلیمی حالت کی رپورٹ صیغہ راز میں لکھ کر بھیجدیتے، میرے پاس ایسے خطوط کا ایک مجموعہ ہے، انشاء اللہ حضرت کے مکاتیب کے ساتھ وہ شائع ہونگے،

تعطیل سب سے نمایاں چیز آپکی تعلیم کی تعطیل تھی، آپ اسکے قطعًا مخالف تھے، کہ مسلسل سال کے گیارہ مہینے طلبہ کو پڑھایا جائے، شعبان، رمضان، شوال میں عمومًا تعلیم بند ہوتی تھی، اسی طرح ہفتہ میں ڈھائی دن منگل اور جمعہ میں درس موقوف رہتا، اور یوں بھی علی سبیل البدلیہ ہفتہ میں ایک دن ضرور ناغہ ہوتا تھا، عجلت پسند طلبہ کے لیے تعطیلوں کا یہ سلسلہ صبر آزما ہو جاتا تھا، لیکن جہاں تک تجربہ سے کہا جا سکتا ہے، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پڑھانے سے زیادہ طلبہ کو پڑھنے کا موقعہ دینا چاہئے، جس کی آسان صورت یہی ہے کہ درس سے زیادہ تعطیل کے ایام کر دیئے جائیں، ورنہ کم از کم مساوی تو ضرور ہونا چاہئے، جن مدارس میں تعطیلوں کا سلسلہ کم ہوتا ہے، عمومًا وہاں کے طالب العلم کم سواد، ضعیف الدماغ، بطی الفہم ہو جاتے ہیں، موعظت ہو یا درس تحول اور ناغہ دونوں میں ضرورت ہے،

طلبہ کی استعداد و تربیت کی عام نگرانی،

بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت طلبہ کی عام نگرانی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ کی متجاہلانہ عرفانی نگاہوں سے کوئی بچا ہوا نہ تھا، خصوصًا اس کا خیال سختی کے ساتھ رکھتے تھے، کہ طالب العلم ایسی کتابیں، یا مضامین نہ پڑھنے پائیں، جن سے ان میں سہولت پسندی، یا سطاحت پیدا ہو جائے، اور اسی لئے آپ اخبار و رسائل جنہیں زیادہ تر بازاری گپ، یا افسانے، تاریخی واقعات ہوتے ہوں، ان کے پڑھنے سے روکتے تھے، ناول اور قصوں کی کتابوں کے پڑھنے سے بھی منع فرماتے تھے، کوئی طالب العلم اگر کسی ایسے استاد کے پاس پڑھنے جاتا تھا، جس کے علمی نظر و فکر پر آپ کو اعتماد نہ تھا، تو اس کو شدت کے ساتھ زجر فرماتے، بعض لوگ اس کو علمی عصبیت پر محمول کرتے تھے، ممکن ہے کہ اس میں اس کا شائبہ بھی ہو، لیکن اپنی نیت کی حدود تک وہ اس میں بھی مخلص تھے، طلبہ اگر وعظ و تقریر کی مشق کرتے، تو فرماتے کہ میہ گدرانے سے پیشتر پکنے کی کوشش کر رہا ہے، سیاسیات سے آپکو خود دلچسپی نہ تھی، تاہم اسلامی معاملات پر عمیق، اور گہری رائے رکھتے تھے، اور اپنے نزدیک کچھ سوچکر سرگرم عمل تھے، لیکن طلبہ کے لیے سیاسی مشاغل کو بھی پسند نہیں فرماتے، اور ساری باتیں اس لیے تھیں کہ آپ کے سامنے ذہنی تربیت اور استعدادی قوت کے مقابلہ میں تمام چیزیں، کم قیمت تھیں، خیال تھا کہ جب نظر بالغ ہو جائیگی تو یہ باتیں خود بخود اپنے وقت پر سمجھ میں آجائینگی، میں نے ایک دن میر زاہد کے رسالہ علم کے متعلق پوچھا کہ آخر نتیجہ تو کچھ معلوم نہیں ہوا کہ علم کی حقیقت کیا ہے، یہ اس طرح راز میں رہا، کہ کتاب کے پڑھنے سے پہلے تھا، فرمانے لگے کہ کتابیں صرف کرتب سکھانے کے مشقی ڈنگل ہیں، مشق کے لیے کوئی بھی چیز لے لو، لکڑی کا مگدر ہو یا لوہے کا، مقصود بازو کی قوت، اور پنجوں کی مضبوطی ہے، کام کا وقت تو میدان میں آتا ہے، جس کا بدن مشقی ڈنگلوں کا کھیلا ہوا ہے، دآن پڑنے پر بازی وہی لیجائے گا، مقصود صرف ذہن کی تائید ہے، اور ان پیچیدہ باتوں سے دماغ کی تمرین و تشحیذ کیجاتی ہے،

(باقی)

فلسفہ کب سے معرض وجود میں آیا،

از

جناب مولوی سید ابوالقاسم صاحب سرور حیدرآباد دکن

(۲)

اس سیاحت کا سرمایہ سات، مگر اب یہ دیکھنا باقی ہو کہ مسئلۂ مذکورہ کا اس سے کس حد پر اکتشاف ہوا، مصر، اسیریا، کالڈیا، بابل وغیرہ وغیرہ کا لٹا ہوا سرمایۂ تمدن یا ان عہود کے کارناموں کا نامربوط اور بوسیدہ مرقع جس کے خط و خال اگرچہ واضح اور نمایاں نہیں مگر جو بھی ہیں اور جیسے بھی ہیں اب یہی ہیں، انھیں کو نظر جماکر دیکھو کہ کیا ان کی تہ میں شامٹ سا فلسفہ کا رنگ نہیں دکھائی دیتا، سراغ فلسفہ کے دوران میں ازمنہ سابقہ کے جو آثار بھی دیکھنے میں آئے یہ سب کے سب فلسفہ کے بعد کے نتائج ہیں، ادوار ماضیہ میں سے کوئی دور ایسا نہیں کہ جس کا پیمانۂ ماحول فلسفہ کی آتش سیال سے بالکل خالی رہا ہو، ہر تمدن ترقی کی دوڑ میں اسکے ساتھ لئے بغیر کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا، مدن، تو تمدن دقت نظر سے کام لینے سے اس امر میں ادنیٰ شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ دور بربریت بھی اس کے سادہ اثرات سے خالی نہیں،

ماہرین طبقات الارض کے سلسلۂ تحقیق میں موالید ثلاثہ سے گذر کر بہیمیت کے حمام میں نوع انسان کی برہنگی آنکھیں دیکھ چکی ہیں مگر ساتھ ہی اس کی ایک ایجاد اولیں کی نوعیت بھی نظر سے گذر چکی ہے، آگ جلانا خواہ وہ حقائق سے آتش سوزاں کا شرارہ نکالا جاتا ہو یا اس کے مشتعل کرنے کی کوئی اور ترکیب ہو اس سے بحث نہیں،

دیکھنا یہ ہے کہ اختراع نار سے پہلے دماغ بشری اقتضائے ضرورت سے اس کے ہر ہر جزو کی خاصیت اور اس کے اشتراکی عمل پر لگاتار قوت صرف کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا جس سے عمل کی انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگارے دکھائی دینے لگے کیا یہ درک حقائق کا نہایت سادہ فعل ابتدائی جو بربریت کے زمانہ میں انسان سے سرزد ہوا فلسفہ کی بالکل سادہ تعریف

میں داخل کرنے کے قابل نہیں،

حقیقت یہ ہے کہ علم وحکمت کسی قوم، کسی فرد، کسی خاندان کا حصہ نہیں، مبدءِ فیاض سے استعداد وقابلیت ہر ایک کو عطا ہوتی ہے، نکات وسرمایۂ دانش کی نہ ورثہ میں تقسیم ہوسکتی ہے، نہ بالائی آمدنی کی طرح اور تدبیروں سے یہ ہاتھ آسکتے ہیں، بلکہ انسان کی ذاتی جد وجہد کا نتیجہ ہے، قدرت کے مائدۂ کرم کی صلائے عام میں ہر کہ ومہ یکسے سب شریک ہیں، کسی کی اولی تخصیص نہیں، ہاں استعداد فطری کی بھوک جسے زیادہ ہوگی وہی اس خوانِ نعمت سے زیادہ بہرہ ور ہوگا، فلسفہ ایک عطیۂ قدرت ہے جس کے ذوق سے علی قدر مراتب بنی نوعِ انسان کا کوئی فرد خالی نہیں، تم کہوگے کہ اس تعمیم کے لحاظ سے تو صنف بشری کو کل کے کل افراد فلسفی ہونے چاہئیں، حالانکہ یہ امر خلافِ مشاہدہ ہے، اس کے جواب کے لئے ذیل کے طرق مختلفہ قابلِ مطالعہ ہیں،

پہلے تو یہ کہ انسان اخذِ معلومات کی بسیط قوت کا حامل ہے، جس کا اثر سعی وکوشش کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا، ہر دور میں اربابِ علم وکمال کا وجود اس کا ثبوت بین ہے، اس لئے کہ انسان کے پاس بطنِ مادر کے تاریک حجرے سے نکلتے وقت تو بیمائگی کے سوا اور کچھ نہ تھا، اس عالمِ رنگ وبو میں رہکر ذاتی جد وجہد کی بدولت قوت عطیۂ صمدی سے کچھ ایسا کام لیا کہ یہ ضعیف البنیان پیکر نور بن گیا، مبدءِ فیاض سے حسب استعداد فیضان ایک مرتبہ ہوچکا لیکن اس کے صرف وعدم صرف کا دار ومدار فاعل کے عزم وارادہ پر ہے، طبقۂ ہنود کے مرتاض راہبوں کے تزکیۂ نفس کے افسانے تم نے سُنے ہوں گے کہ اپنے یہاں کے اصول مذہب کی بنا پر خوشنودی وتقرب ذات بحت کے لئے وہ اپنے بعض اعضا کو بالکل از کار رفتہ کردیتے ہیں، مثلاً اتنی مدت تک ہاتھ بلند رکھا کہ دورانِ خون کا سلسلہ بالکل بند ہوا اور پورا ہاتھ خشک ہوکر رہ گیا، فاعل کی قوت وفعل کا اس سے اندازہ کرو کہ قدرت کے دیئے ہوئے سرمایہ پر اسے ایسا اختیار حاصل ہے کہ جس سے چاہتا ہے کام لیتا ہے اور جس سے کام لینا پسند نہیں کرتا اسے اٹھا کر طاقِ تعطل پر رکھ دیتا ہے، ایسی صورت میں عطیۂ قدرت سے تمتع اور عدم تمتع کا انحصار فاعل کے عزم وارادہ پر ہے، کسی متمول کا گدائے دریوزہ گر سے ذلیل ومحتاج تر اپنے آپ کو خیال کر لینا اور کسی نجی مزاج کا اپنے دلِ خاکی کو آبگینہ تصور کرکے نشست وبرخاست میں غیر معمولی احتیاط سے کام اس وجہ سے لینا کہ ذرا سی ٹھیس سے کہیں آبگینۂ جسد میں بال نہ آجائے اسے کیا تم واقعیت کہو گے یا قصورِ فہم پر محمول کروگے،

پیشگاہِ واحدیت سے صنف بشر کو جو قوی مرحمت ہوئے ہیں ان سب کے مراتبِ اثر جداگانہ ہیں، ان میں بعض ایسے ہیں کہ انکا صدور وفعلیت ہماری تحریک واعتنا سے بالکل بے نیاز ہے، حواس ظاہری کو دیکھو کہ اپنے اپنے وقت پر ان میں سے ہر ایک انسان کو اپنا معمول بنالیتا ہے مثلاً دیکھنا، سننا، چھونا، چکھنا، سونگھنا، ایک صحیح المزاج انسان پر اپنے اثر کا پرتو ڈالا کرتے ہیں اور انسان ان کی پذیرائی کے لئے مجبور ہے کیونکہ بھوک کی خواہش پر بغیر استعمال غذا رہ نہیں سکتا، تشنگی کا احساس آب سرد کی جانب لیجاتا ہے، خوشبو یا بدبو میں قوت شامہ امتیاز کرکے خود بخود صاف صاف حقیقت ظاہر کردیا کرتی ہے، ایوانِ سماعت میں مہمان صوت کے داخل ہونے کے لئے کسی وقت کوئی مانع ومزاحم نہیں ہم اپنے کمرہ میں مختصر سی میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے کسی اہم معاملہ یا کسی نازک علمی مسئلہ کی پیچیدگی دور کرنے میں ایسے منہمک اور مصروف ہیں کہ گویا اس کے ماسوا تمام دنیا ومافیہا سے اس وقت کچھ سروکار نہیں، ہمارے پورے خیالات کی تمام شعاعیں صرف ایک مرکز پر کام کر رہی ہیں، مگر اس عالم مصروفیت میں بھی ہم اس وقت کے لحاظ سے غیر متعلقہ حواس کی زد سے محفوظ نہیں، سرود خانۂ ہمسایہ کی خوش آیند صدائیں اگرچہ ہم اس جانب ملتفت نہیں مگر ہماری قوت سامعہ کے سامنے اپنے وجود کا ثبوت پیش کر رہی ہیں، کمرے کے باہر جو منظر بھی پھیلا ہوا ہے اس انہماک میں بھی پیش نظر ہے، سیب کی قاشیں جو طشتری میں سامنے رکھی ہوئی ہیں اسی عالمِ محویت میں ان کے کھانے پر قوت ذائقہ برابر اطلاع دے رہی ہے، خوشبو سے لدی ہوئی ہواؤں کے فرحت افزا جھونکے جو کمرے میں آرہے ہیں ان کی عطر بیزی کا احساس بھی ایسے وقت میں ہم سے جدا نہیں، یہ تو ان حواسوں کا مختصر سا تذکرہ تھا جن کی اثر افگنی ہمارے ارادے اور توجہ کی رہینِ منت نہیں، ان کے سوا کچھ قوی ایسے بھی ہیں کہ ان کا وجود تو وجودِ انسان کے ساتھ ہوچکا مگر ان کی اثر خیزی اور فعلیت انسان کی توجہ تام اور سعی مفرط کے بغیر ظاہر ہی نہیں ہوتی، دماغ کو دیکھو کہ یہ قوائے باطنیہ کا سرچشمہ ہے، لیکن جب تک انہماک تام اس کی جانب صرف نہ کیا جائے اس وقت تک بے اعتنائی اور عدم توجہ کے خس وخاشاک سے ایسا خس پوش رہتا ہے، کہ بظاہر حس کے وجود وعدم وجود میں کوئی حدِ فاصل معلوم نہیں ہوتی، یہاں قوائے دماغی سے مراد محض عقلیت ہے اور نہ ظاہر ہے کہ ہر قسم کے جذبات جنکا منبع دماغ ہی ہے، ان کی فعلیت حواس ظاہری کی طرح انسان کی ہمنشینی ومصاحبت سے کبھی اجتناب

نہیں کرتی، یہ بھی مسلّم ہے کہ قوائے عقل کی جانب توجہ و انہماک خود بخود نہیں ہوتا، اس کی جانب میلان کے لئے بڑے سامان کی ضرورت ہے، بیشتر و اکثر انسان میں پستی و بلندی اس کے ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے، مثلاً اہل دیہہ کو ابتدا سے اپنے گرد و پیش ایسے سامان پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں کہ کبھی خواب میں بھی انھیں اس امر کی اطلاع نہیں ہوتی کہ ان کے پاس ایک عجیب طاقت و قوت کا خزانہ بھی ہے جس کا صرف انھیں حقیقی معراجِ ترقی تک پہونچا سکتا ہے، وہ بہائم کی سی زندگی بسر کرنے کو ہی مقصدِ حیات سمجھتے ہیں، اور یہ خیال ان کے اعقاب میں منتقل ہوتا ہوا چلا آتا ہے، تو گویا وہ نامساعدتِ ماحول کے شکار بن گئے، ان سے آگے بڑھکر وہ طبقہ ہے جس کو کسی تحریک کی وجہ سے اپنی اس پوشیدہ قوت سے کام لینے کا شوق و ولولہ پیدا ہوا، اگر سوسائٹی اور سامانِ تربیت نہ میسر آنے سے فوری جوش ہانڈی کے ابال کی طرح آیا اور فرو ہو گیا، اب ان افراد کا نمبر ہے کہ جنھیں مساعدتِ ماحول سے کل سامان فراہم ہے مگر عوارضِ جسمانی یا اس کے مماثل اور ایسے موانع سدِ راہ ہو گئے کہ اس میدان میں بعض تو دو قدم بھی نہ چل سکے اور بعض نے کمرِ ہمت باندھی بھی مگر یہ خیال دیرپا نہ رہا، اور اصل منزل تک رسائی نہ ہونا تھی نہ ہوئی، سب سے آخر میں ہر دور میں گنتی کے وہی چند نفوس باقی رہجاتے ہیں جو تشنگیِ ذوق سے میدانِ طلب میں تمام عمر پھرتے ہی رہتے ہیں، ان کی پاک یادگار کا نقش جریدۂ عالم پر ثبت ہوتا رہتا ہے، اثر تربیت اور مساعدتِ ماحول کو معمولی نہ سمجھنا، عبد الواسع جبلی کا حال فارسی تذکروں میں پڑھا ہوگا، کہ ابتدا میں یہ ایک لنگوٹی لگائے یک بینی و دو گوش جنگلوں میں اونٹوں کو چرایا کر پھرتا تھا، مگر اس کا حال مستقل تربیت ہی کی بدولت کیا سے کیا ہو گیا، وہی فردِ جو وحشت و جہالت کے خار زار میں مارا مارا پھر رہا تھا آج وہی فارس کے ایوانِ ادب کا معزز کرسی نشین ہے،

حاصل یہ کہ قوائے عقلیہ کی زمام اختیار ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم خود ہی اپنے اختیار سے کام نہ لیں تو یہ ہمارا قصور ہے، اس سے فقدانِ قویٰ لازم نہیں آتا، ایک دہقان بچہ بالقوی فلاسفر ہے اور مراتب تربیت کے فراہم ہو جانے سے بشرطیکہ دستِ موانع کوتاہ رہے، تو یہی بالفعل فلسفی بھی بن سکتا ہے، فلسفہ کائنات سے کسی جداگانہ حقیقت کا نام نہیں بلکہ ہر وجود بجائے خود ایک فلسفہ ہے، یہاں تک کہ تمام دنیا و ما فیہا فلسفہ ہے، اور فلسفہ دنیا و ما فیہا

جس طرح انسان سے فلسفہ کوئی علیحدہ شے نہیں اسی طرح انسان فلسفہ سے جدا نہیں، ہر ہستی کی بقا تک اس کا فلسفہ بھی باقی رہتا ہے، اور اس کے فنا ہونے پر اس کا فلسفہ بھی روپوش ہو جاتا ہے، کائنات فلسفہ کا منبع ہے، اس کے وجود کے ساتھ ہی ساتھ اس کا ظہور بھی ہوتا ہے اور اس کے نیست و نابود ہونے پر اس کا خاتمہ بھی ضروری اور یقینی ہے، قدرت کی جانب سے ہر طبیعت حسبِ استعداد و فطرت مواد فلسفہ لیکر آئی ہے، یہ اور بات ہے کہ کسی نے اس قوت معطیہ سے کام لیا اور کسی نے اسے یوں ہی کس مپرسی اور بے اعتنائی کے انباروں کے نیچے دبا رہنے دیا، غرضکہ جب سے وجود کی ہنگامہ آرائی شروع ہوئی اسی وقت سے فلسفہ بھی سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلا آتا ہے، جس زمانہ میں دنیا مصری، ہندی، یونانی، حیرت زائیوں کا تماشا دیکھنے میں مصروف تھی، یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ اس وقت گنتی کی چند قوموں کے پاس ہی فقط فلسفہ کا سرمایہ موجود تھا، اور باقی اقوام و ملل اس سے بالکل ہی تہیدست تھیں نہیں ایسا نہیں بلکہ اس دور میں بھی، اور اور جگہ کچھ نہ کچھ ایسے افراد ضرور موجود تھے جو گمنامی کے ویرانوں میں بجھے ہوئے چراغوں کی طرح پڑے ہوئے تھے، ذوقِ فلسفہ کے یہ شیفتہ و دلدادہ ضرور تھے مگر موانع کی مداخلت سے ان کا ذوق لازم متعدی کی وسعت تک نہ پہونچ سکا، بہر صورت فلسفہ کسی جدید علم یا فن یا انوکھا انکشاف یا نیا اجتہاد یا خارج از کائنات شے کا نام نہیں بلکہ یہ وہی علم، وہی اجتہاد، وہی فیضان، وہی ودیعت ہے جو علی قدرِ مراتب ہر ایک فردِ بشر کو پیشگاہ قدرت سے مل چکی ہے، ابتدا سے وجودِ فلسفہ یوں ہی چلا آتا ہے، اور اسی طرح چلا جائیگا، ہر ہستی اور ہر وجود علیحدہ علیحدہ جداگانہ فلسفہ کا محور یا مرکز ہے، جسے خود اپنی حالت کا اندازہ نہیں، نوعِ انسان ہی ایک ایسی موشگاف اور راز جو واقع ہوئی ہے، کہ اپنی اور دوسری موجودات کی فلسفیت کی سراغ رسی میں ایک جگہ چین سے نہیں بیٹھتی اور حسبِ طاقت اسکے تہ لگانے میں منہمک ہوا کرتی ہے، تو فلسفہ کو وجود کا ہمزاد، [illegible] اسکا ندیم و مصاحب سمجھنا چاہئے، جبسے ہستی کا گھر بسا جبھی سے خانۂ وجود اس کی رونق سے معمور چلا آرہا ہے، اس بیان سے ظہورِ فلسفہ کا ایک خاکہ اگرچہ پیشِ نظر ہو سکتا ہے مگر پھر بھی یہ بیان مکمل نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ابھی دورِ حاضر کی مزید تحقیق کا بہت کچھ سرمایہ باقی ہے، جسے تنقیدی نظر سے دیکھنا ہے، کہ اس بیان کی اس سے کس حد پر تائید ہو سکتی ہے،

علت العلل نے انسان کو دو حصوں میں منقسم کیا، حصہ اعلیٰ اور حصہ اسفل، موخر الذکر کاتہ خانہ حیوانیت کی دھماچوکڑی کے لئے مخصوص ہے، اور مقدم الذکر یعنی حصۂ اعلیٰ عقلیت کا حریم ناز ہے، اگر زیادہ کاوش سے کام لیجئے پر انسانی نشو ونما کی تین صورتیں معلوم ہوتی ہیں، حیوانی، احساسی عقلی، قوت حیوانی انجذاب قوت کا ذریعہ ہے، جس سے انسان میں قوت وطاقت کی رسد برابر پہونچتی رہتی ہے، صنف حیوانات میں یہ قوت ان کے نشو ونما اور تدریجاً ان کی نسلوں کے نمو میں کام آتی ہے، صنف مذکور میں زیر تذکرہ قوت کے مصرف کا اگر اور زیادہ تجسس کیا جائے تو طعمہ کی جستجو اور آشیاں سازی وغیرہ بس یہی دو ایک باتیں معلوم ہو سکیں گی، ہاں نوع انسانی ذخیرۂ قوت حیوانی سے حسی اور عقلی حصوں میں بھی کام لے سکتی ہے، گویا اس کے اختیار میں ہے کہ اس کا رخ جدھر چاہے پھیر دے،

اغذیہ سے حاصل کی ہوئی قوت مثل ایسے اثاث البیت کے ہے، جس کا ایک مقام سے دوسرے مقام پر حمل ونقل ممکن ہے بغیر ممکن نہیں جسمانی نشو ونما کا منتہا اور دماغی ترقی کی تکمیل ان دونوں میں سے ہر ایک اچھی طرح اس قوت سے ہو سکتی ہے، انسان کا اختیار تمیزی اس باب خاص میں حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے، اور اس کی صوابدید پر یہ سرمایہ تحت تصرف آتا رہتا ہے، ایک دہقانی یہ پوری قوت اپنی جسمانی پرورش اور اس کی غور پرداخت میں صرف کرنے کا عادی ہے، تربیت وتعلیم اس فوارہ کا رخ قوائے دماغی کی جانب پھیر دیتے ہیں، جس سے عقلیات کا چمن سرسبز وشاداب رہا کرتا ہے، اس قوت کے منتقل ہو کر دماغ میں پہونچنے اور اس سے نمایاں اثرات مرتب ہونے کی بڑی طولانی داستان ہے، مگر چونکہ دلچسپ ہے اس لئے وہ سب کی سب نظر انداز بھی نہیں کی جا سکتی،

قوت حیوانی کا بیان مجمل

ذخیرہ قوت حیوانی کے اثر سے خون دماغ کی سطح پر دوڑ جاتا ہے، اسی سے خاکستری رنگ کے عروقی مادہ میں وہ تغیر ظاہر ہوتا ہے، جسے آفرینش خیال کی نشانی یا علامت سمجھنا چاہئے، حالت بیداری میں حرکت اور حرکت سے تحلیل پیدا ہوتی رہتی ہے، جس سے اس قوت میں کمی اور نقصان آجاتا ہے، عالم خواب کی سیر سے اس انتقاص کی تلافی

اور دماغی غدود میں ترقی واضافہ ہوتا ہے، خون کے بننے اور اس کی زیادتی کے ساتھ ساتھ عمل تحلیل بھی برابر جاری رہتا ہے، یعنی ناکارہ اجزا فضلہ کی صورت میں مجاری بول وبراز اور مسامات کی راہ سے خارج ہوا کرتے ہیں، قوت منجذبہ کے غیر ضروری اور ناکارہ اجزا کی علیحدگی کے بعد دماغی تحرک کا سبب ہوتے ہیں، اور اس تحرک یا ورزش سے خیالات کی تماشاگاہ تیار ہو جاتی ہے جس کا مسکن دماغ ہے، اس قوت کی بڑی مقدار صرف ہو کر ان نوزائیدہ خیالات کے ثبات وبقا کا سبب بنتی ہے، دماغ کے حصول قوت کا انحصار محض غذا ہی پر نہیں بلکہ ہر حس کی طرف سے تھوڑی بہت قوت کی سوغات اس کے پاس پہونچتی رہتی ہے، اور ایک عضلہ سے توازن وتوت برقرار رہتا ہے، اور فعل اعصاب برابر قوت کے سانچہ میں ڈھلتا رہتا ہے،

حواس ظاہری مثلاً باصرہ، سامعہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ کے حدود واثر سے جو چیزیں باہر ہیں اس کے بارہ میں کوئی خیال بھی قائم نہیں ہو سکتا، مادرزاد نابینا تصور الوان اور ان کی امتیازی حقیقت کی شناخت میں مجبور محض ہے، کیونکہ وہ قوت جو ان تصورات وخیالات کا سرچشمہ ہے، جب وہی مفقود ہے تو پھر اس قسم کے تصورات کی گنجائش کہاں، خیال کے کتبخانہ میں حواس ظاہری کی یادداشتوں کی تالیفیں محفوظ رہتی ہیں، یہ تالیفیں ادراکات کے محصلہ نتائج ہیں، تیز حیوانی احساس ظاہری کی متابعت میں کلام کرتی ہے، جسمیں تعقل کا شائبہ تک نہیں ہوتا، بخلاف انسان کے کہ اس میں اثر احساس کی دوڑ اعصاب دماغی تک ہے، جو آفرینش خیال کا مقام ہے، یہیں خیال ظہور پذیر ہو کر قائم رہتا ہے، اثر جسمانی کے ذریعہ سے اشیائے خارجی کے علم کا نام احساس ہے، اور ادراک عقل کا باب مرور، دماغ کے وہ اعصاب جو احساس کی پذیرائی کے لئے آمادہ رہتے ہیں، انسان کے پاکیزہ جذبات کا محل اور مقام ہیں، کسی خیال کو پاکیزہ اور لطیف جذبات کی شکل میں بدل دینا انسان کے اختیار میں ہے، اعضائے انسانی میں دماغ ایک خاص امتیاز اور ایک مخصوص فضیلت رکھتا ہے، اسے عقل کا دار الامارۃ کہنا کسی طرح ناموزوں نہیں، شرف دماغ تسلیم کرنے کے بعد جذبات کا نمبر ہے، اور بجائے خود ان کی جو اہمیت ہے اس اعتبار سے ان کی بزرگی وقعت ومنزلت میں بھی ادنیٰ شک کی گنجائش نہیں، اس وجہ سے کہ قوائے عقلی کی تحریک ان سے وابستہ ہے،

انسانی اندوہ و مسرت کی فہرست انھیں کے پاس رہتی ہے، نوع بشر کی وہ مجبوب و دلپسند چیزیں جن کا نظارہ اس کے لئے حظ اندوز ہے، یہی جذبات ایسے منظر کی واپسی اور لذت اثر کے اعادہ کے لئے عقل کو پھسلاتے ہیں، اور وہ اشیا جن سے انسان کو قاطبۃً نفرت ہے، ان کے لئے وہ جذبات عقل کو ایسی راہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں جہاں انکا نام و نشان تک نہ ہو، دماغی ترقی، تمدن کی چہل پہل، فنون لطیفہ کی اثر انگیزی، یہ سب کے سب جذبات ہی کا کرشمہ ہیں، مطالعہ سے اگر لطف و مسرت کا حصہ علٰحدہ کر دیا جائے تو پھر دماغی ترقی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی، دلا کی تمنا، اعزہ و اقارب کی محبت، دوستوں کی الفت نہ ہو تو پھر کسی خاندان کسی قبیلہ کسی سوسائٹی کا وجود کیسا تمام دنیا گلِ بےرنگ، نخلِ بےثمر، شراب بےکیف، گوہر بےضیا بنکر رہجائے، تناسب صوت و لونیت و شکل اگر مسرت سے ہمدوش نہ ہو تو فنون لطیفہ پھر کسی مصرف کے نہیں،

کیمیاوی طریقہ پر اگر حیات انسانی کی تحلیل کیجائے تو حیات نباتی اور حیات انسانی یہی دو قوی عنصر نظر آئیں گے چونکہ موالید ثلاثہ میں نباتیت کو حیوانیت پر تقدم زمانی حاصل ہو، اس لئے کہ وجود نباتیت کے وقت حیات حیوانی کا کہیں نشان تک نہ تھا، اک زمانہ کے بعد ایوان ہستی میں اسے باریابی نصیب ہوئی، اسی ترتیب کا اثر حیات بشری میں دیکھو کہ بچہ سے پہلے پہل وہی افعال سرزد ہوتے ہیں جنھیں حیات نباتی کا سرمایہ دار کہنا چاہیے، بدل ما تحلیل کی حاجت، سردی و گرمی کا احساس، نیند کی ضرورت، ولادت کے ساتھ ہی یہ حیات نباتی کی ضروریات اپنی گم اپنا عمل کرتے ہیں، اور جس طرح موالید ثلاثہ میں آخری درجہ حیوانیت کا ہے، اسی طرح حیات نباتی کے مخصوصات حاصل ہونے کے بعد مولود میں حیات حیوانیت کی اثر انگیزی کا ہنگام آتا ہی، ہر وقت کے پاس رہنے والوں کی طرف بچہ کا میلان اور اجنبی سے وحشت و نفرت، یہ وہی حیوانی ادا ہیں، نشست و برخاست کی طاقت، چلنے پھرنے کی قوت وغیرہ وغیرہ حیات حیوانی ہی کے مظاہر ہیں، انسان کی ترقی کے لئے جس طرح قوائے عقلی کا نمو نہایت ضروری ہے، اسی طرح جذبات کا نشو و نما بھی اس کے لئے لازمی ہے، جذبات و خیالات میں اتحاد کے پینگ ایسے بڑھے ہوئے ہیں کہ بیشتر و اکثر انھیں مل جل کر ہی کام کرنا پسند ہے، اگر کبھی اتفاق سے ان میں کشیدگی بھی واقع

ہو جاتی ہے، اس طرح کہ خواہش کا میلان کسی خاص سمت کی جانب عقل کو پسند نہیں آتا اور وہ سدِ راہ ہو کر اس رجحان کو روکنے کی کوشش کرتی ہے، خواہش کے رجحان کی نسبت عقل کی ناپسندیدگی و بیزاری یہی چیز مابہ النزاع بنجاتی ہے، اثر جذبات سے جسم بہت متاثر ہوا کرتا ہے، محرور المزاج افراد ہر وقت کے دیو غضب بنے رہنے سے امراض قلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں، شرم و انفعال کی وجہ سے سطح جسم پر خون کی لہریں دوڑتی پھرتی ہیں، سخت جذبات سے دماغی ریشوں میں بےترتیبی اور امراض دماغی سے عقل میں پھر استقامت باقی نہیں رہتی بعینہ اسی طرح حالات جسمانی کے اثرات جذبات ہی تک نہیں پہنچتے بلکہ توسط جذبات سے دماغ تک جا کر رکتے ہیں، بیمار اشخاص ضدی بچوں کی طرح ذرا ذراسی بات میں بگڑتے ہیں اس لیے کہ طبیعت کی پستی اور کمزوری کے اثر سے خواہشیں بھی پست و کمزور ہو کر رہجاتی ہیں، بخلاف قوی اور توانا افراد کے کہ ان کے جذبات بھی مثل ان کے قوی ہوا کرتے ہیں، عقل و جذبات یہ دونوں ایسے سہیم و شریک ہیں کہ ان ہی سے متمدن حیات انسانی کا کاروبار چلتا ہے، افراط و تفریط سے ایک پلہ گراں وزن ہو جاتا ہے، اور دوسرا بے وزن، پس ایک مہذب و ترقی پذیر زندگی کے لیے ان دونوں پلوں کا توازن اور وزن کی مساوات لازمی شے ہے، اگر قوائے عقل ہی کی جانب رجحان ملتفت ہے تو عقلی نمو اس حد پر ہوگا کہ جذبات مردہ اور ناکارہ ہو کر رہجائیں گے، اور اگر میلان طبعی جذبات ہی کی دیکھ بھال میں مصروف رہا تو قوتِ جذبات کے سامنے عقل ایسی حقیر معلوم ہونے لگے گی، جیسے کسی کوہ پیکر پہلوان کے سامنے ایک شیر خوار بچہ، جذبات و عقل کا اتحاد باہمی تعاون و استعانت پر مبنی ہے، قوائے عقل کے فرائض تحریک جذبات سے وابستہ ہیں اور جذبات کو مرکزِ اعتدال تک پہنچا کر ان کے قیام کی نگرانی عقل کا فریضۂ خدمت ہے،

مہذب و متمدن انسان دو معلموں کی آغوشِ تربیت اور کنفِ تعلیم میں مدت العمر بسر کرتا ہے، ایک عقل، اور دوسرے جذبات، عقل صفر تشخص و وقار کا سبق پڑھاتی ہے جذبات اصول تمدن کی تعلیم دیتے ہیں، مجرد عقل کے اکتساب تعلیم سے انسان اکھل کھرا اور تنہا نشینی پر آمادہ ہو جاتا ہے، وہ خود

کو اکیلا اور تنہا جانتا ہے، جس میں دوئی کا شائبہ تک نہیں ہوتا اسی لیے کنجِ عزلت کے بغیر اسے حقیقی اطمینان و مسرت نہیں نصیب ہوتی، اپنے ہمجنسوں سے وہ کوسوں دور بھاگتا ہے، باہم ملکر بیٹھنے اور لطفِ صحبت سے حظ اندوز ہونا اسے پسند نہیں آتا، اور اس قسم کی بیزاری اسے سب سے علٰحدہ ایسے ایک خلوتکدے کی تلاش پر مجبور کرتی ہے کہ جہاں وہی وہ ہو اور اس کے تخیل کی فضا مجالست و مشارکت کے گرد و غبار سے بالکل پاک و صاف ہو، مگر جذبات کا طرزِ تربیت اس سے یک لخت جداگانہ ہے، وہ اس امر کی اہمیت ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ انسان تنہا نہیں بلکہ وہ اپنے ابنائے جنس کے سلسلہ کی مسلسل ایک کڑی ہے، اسی کل کا ایک پرزہ، اسی قافلہ کا ایک فرد، اسی کل کا ایک جزو، اسی سمندر کا ایک قطرہ ہے، اس لیے اسے مل جلکر آپس میں شیر و شکر ہو کر رہنا چاہیئے، اس تفہیم سے پر قوت جذبات کے اشخاص کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ بغیر اپنے ابنائے جنس کے جھرمٹ کے رہ نہیں سکتے، تنہائی ان کے لیے موت سے کم نہیں، باہم میل جول، اختلاط، شیر و شکر کی طرح گھل ملجانا، لطفِ صحبت اٹھانا اس سے بڑھکر ان کے نزدیک کوئی نعمت ہی نہیں، جذبات سے بے نیازی کی صورت میں صرف عقل ہی کارفرما رہتی ہے جس سے تنہانشینی کے علاوہ فی الجملہ تنگ ظرفی اور خودغرضی بھی پیدا ہو جاتی ہے، اپنی فلاح و بہبود، حفاظت و خویشتن بینی کے سوا اور کسی طرف نظر ہی نہیں جاتی، اپنی ذات ہی ہمہ وقت نصب العین بنی رہتی ہے، اور دوسرے کا خیال کبھی بھول کر بھی قریب نہیں پھٹکتا، جذبات اس قسم کی خودغرضی کو ایک سکنڈ کے لیے جائز نہیں رکھتے، وہ انسانی ذاتی غور پرداخت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی جانب بھی ملتفت ہونے پر مجبور کرتے ہیں جس سے متمدن مقامات رونق اور چہل پہل سے لبریز ہو جاتے ہیں، انھیں کی بدولت ایثار، انس، ہمدردی، محبت و مروت کا انسان سرمایہ دار بنتا ہے، اور یہی جذبات انسانی کو ایسا ذکی الحس بنا دیتے ہیں کہ دوسروں کی اذیت و تکلیف کو یہ پیکرِ خاکی اپنی ہی روداد الم سمجھنے لگتا ہے، اس عمل ہم آہنگی اور ایثار سے قوائے دماغی ترقی کی شاہراہ پر برابر بڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں، اور ہر جانب سے علوم و فنون کے قدرتی چشمے بہ نکلتے ہیں،

نیچر نے موجوداتِ عالم میں سے ہر ایک کو اس کی استعداد اور طبعی مناسبت کے لحاظ سے سامانِ حیات تفویض کیا ہے، مثلاً نباتات کی زندگی کے لیے کچھ تھوڑی سی روشنی اور کچھ ہوا اور زمین کے بعض اجزا کا کچھ حصہ درکار ہے گویا اس کے عہدِ طفولیت ہی میں تکمیلِ حیات کی کل چیزیں رکھدی ہیں، اور چونکہ طلب تکمیلِ حیات کے لیے اسے دوڑنے دھوپنے کی ضرورت ہی نہیں اس لیے قوت حرکت ارادی اسے نہیں دی، صنف حیوانات جن کی ضروریاتِ زندگی ایک جا نہیں بلکہ دور دور تک چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں جن تک رسائی بغیر حرکت کے ممکن ہی نہیں اس بنا پر اس صنف کو حیات کی تکمیل کے لیے یہ قوت عطا ہوئی کہ مدارجِ زندگی کے طے کرنے میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہ رہے، اس کے علاوہ صنف مذکور سے دو قوتیں اور زائد حیوانات کے حصے میں آئیں جنھیں مسرت و تکلیف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، نوعِ بشر چونکہ قدرت کی پرکارِ اعتدال کا مرکز ہے اس لیے وہ وسیع اور سحر طراز قوتیں اس کے ہاتھ آئیں جس کا اور موجودات کو کبھی خواب دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا،

حیوانات کو احساس حرارت و برودت سے بیشتر ہی ان کے اقتضائے طبعی کے موافق نہایت پائدار پوستینیں دیدی گئیں، اک انسان ہی اس طرح آغوشِ وجود میں آیا کہ عریانی ہی اس کی پردہ پوش نہیں، اس پر طرہ یہ کہ اس کے سطحِ اعصاب میں قوتِ احساس زیادہ اور بہت زیادہ ودیعت کر دی، وہ بسیط قوت جو خصوصیت سے اس کو دیگئی، اس نے اسی سے رفعِ حر و برد کے لیے لباس بنایا، نئی نئی وضع کے کپڑے تیار کیے

قوائے انسانی پر اگر نظرِ غائر ڈالی جائے تو ان کی وسعت حدِ نگاہ سے بھی ادھر معلوم ہوگی، بغیر اس امر کے اعتراف کے کوئی چارۂ کار ہی نہیں کہ اس میں حیوانی یا مادی زندگی سے بالاتر ارفع و اعلیٰ قوتیں بھی موجود ہیں، تناسبِ الوان، حسنِ صورت، حسنِ صوت، حیاتِ حیوانی میں ان کی کچھ قدر نہیں، لیکن یہی چیزیں انسان کے زرتار خلعتِ مسرت و دلچسپی کے جیب و دامن ہیں، یہی انبساطی کیفیات جنہیں حیوانیت اور مادیت سے ادنی علاقہ نہیں اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ نوعِ انسانی میں جملہ قوی مافوق ایک وہ دیرینہ روحانی قوت ہے، جس کو مذہب کا خزانہ کہنا چاہیئے، اس اعتبار سے عقل اور جذبات پر بھی ایک اور فرمان روائی قائم کر

حیوانات دونوں ایسی ان بہتا ہونے نہیں دیتی اور ظاہر و باطن میں یکسانیت برقرار رکھتی ہے، انسان سے جو افعال صادر ہوتے ہیں ان کی باگ عقل و جذبات کے ہاتھ میں دے کر خود نگرانی کرتی ہے کہ جادۂ اعتدال سے کسی کو آگے نہ بڑھنے دے، اس حکومت کا نام مذہب ہے، جو بدو تخلیق سے انسان کا رفیق تنہائی ہے، جنود عقلی اور لشکر جذبات کی قیادت و سپہ سالاری کی اہم خدمت اس ترقی میں دونوں کی برابر برابر ایسی صف بندی کہ حد اعتدال سے کسی کو بیشقدمی کی جرأت نہ ہو اور قوت حیوانی والی رسد علی السویہ دونوں لشکروں میں پہنچتی رہے، یہ انتظام و انصرام قائم عظم یعنی مذہب ہی سے وابستہ ہے جو ابتدا سے انسان کا مونس تنہائی رہا اور اس وقت تک ساتھ ہے اور اسی طرح آئندہ بھی ہستی کے جلوس کے ساتھ ساتھ اس کی دقت کی سواری کا چلنا یقینیات سے ہے، اس تحقیق سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے سالخوردہ پیر خم کمر کی مجالست سے پہلے انسان کے گرد و پیش سوائے ایک تمیز طبعی کے اور کچھ نہ تھا، تمیز طبعی کے بعد جو سب سے پہلا انسان کا غمگسار بنا وہ مذہب ہے، مگر اس بیان سے بھی فلسفہ کی قدامت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، کیونکہ تحقیق بالا پر غور کرنے کے بعد اس امر میں ادنیٰ شک کی گنجایش نہیں رہتی کہ فلسفہ کی تخم ریزی کے بعد مذہب کی روئیدگی شروع ہوئی، چونکہ یہ بحث توضیح طلب ہے اس لیے فی الجملہ تفصیل سے اس پر اظہار خیال کیا جاتا ہے،

سب سے پہلے مذہب کی حقیقت بیان کر دینا ضروری ہے، تاکہ اخذ مطلوب میں کوئی دقت نہ ہو، مذہب کیا ہے؟ اس کا جواب مختلف پیرایوں میں دیا جاتا رہا، مثلاً عجز و کمزوری کا مستقل احساس اور دلیں مضار سے بچنے کی سپر، بہ لحاظ ذہن دہشت و خوف کا احساس اور باعتبار خارج نتیجۂ خوف کے تصورات و رسوم کا مجموعہ، ایک منتہا کا تصور، ایک سلسلۂ تجسس، ایک سوزش پایندہ، ایک اعتراف اعتقادگی، ایک فطری تشنگی، ایک ذوق ابدی وغیرہ وغیرہ؛

ہربرٹ اسپنسر اور دوسرے ارباب تحقیق نے مذہب کے ابتدائی آغاز کی علت تامہ خوف و دہشت قرار دی ہے، خوف و دہشت کو اگر فی الجملہ لگاؤ ہو تو چنداں قابل التفات نہیں لیکن اسے علت تامہ قرار دینا ضرور قابل نظر ہے اس پر انتقاد و تبصرہ کی نہ ہمارا موضوع بحث اجازت دیتا ہے، ورنہ اس کی تفصیل کی اس مختصر میں گنجایش

مگر بطریق ایجاز اس جگہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ انسان نے قطع منازل حیات کے دوران میں سنگین مجسموں کو مظہر الوہیت سمجھا، نونہالان چمن پر عقیدت کے سہرے چڑھائے، اپنے سے فرو تر صنف حیوانی کی پرستش کی، مبسم برق اور رعد کی بلند آہنگی، بحر زخار اور جبال فلک بوس ان کے سوا اور سینکڑوں مظاہر قدرت کے سامنے اس نے سر نیاز جھکایا، اس کی علت بالکل خوف کس طرح قرار پا سکتی ہے کیونکہ اس کے لیے ہرب و اجتناب لازمی ہے اگر ڈر اس کا محرک قوی تھا تو اس سے کوسوں دور بھاگنے کی کوشش کرتے اور جب کبھی قریب تک نہ آتے حالانکہ نتیجہ بالکل اس کے برعکس ہے، رہزن مرگ کی جانب سے نقد حیات کی تاراجی کا خوف اگر دل میں گھر کر گیا تھا تو اس کے لیے اپنی اپنی جگہ موت سے ڈرتے رہنا کافی تھا نہ یہ کہ غور و خوض کے بعد اپنے سے ایک بالاتر طاقت کو مرکز پرستش قرار دینا اور اسی جذبہ کی روز افزوں ترقی میں مصروف رہنا خوف و ہراس کے بجائے بطیب خاطر قوت ارادی کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے بہرطور اس کا جواب جو بھی ہو اس وقت اس سے بحث نہیں بلکہ ظاہر کرنا یہ ہے کہ ابتدائے ازمنۂ مظلمہ میں ظہور مذہب خود بخود تو ہوا نہیں کہ نوع بشری نے بے سوچے سمجھے اسے اختیار کر لیا، لامحالہ پہلے اس نے دماغ کاوی سے اس طرح کام لیا کہ اقتضائے وقت کے لحاظ سے اپنی حالت پر پہلے تفصیلی نظر ڈالی اور اپنی ہیچمیرزی، بیچارگی، عجز و کمزوری کا پورا پورا احساس شروع ہوا، احساس افتقار کا آنا تھا کہ استعانت کا خیال پیدا ہوا، جب ان مقدمات کی ترتیب مکمل ہو چکی تو اس غور و خوض اور ترتیب مقدمات کا نتیجہ مذہب کی شکل میں ظہور پذیر ہوا، مذہب کے قبضہ سے پہلے درک حقائق کا پرپیچ اور دشوار گذار راستہ اس وقت کی استعداد کے موافق دماغ ایسا صاف کر چکا تھا کہ جس کے بعد مذہب آ دھمکا، اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ مذہب کوئی مصنوعی یا خود ساختہ شے ہے، نہیں بلکہ وہ ایک جذبۂ فطرت ایک جبلی خواہش کا نام ہے، آزاد خیال کو بھی اس کی غلامی سے مفر نہیں، پہلے ظاہر کیا جا چکا ہے کہ انسانی قوتیں سب کی سب پیدا ہونے کے ساتھ ہی مرکز عمل نہیں بنتیں، بعض تخلیق کے بعد ہی ساتھ ہو جاتی ہیں، بعض ایک وقت معین کی منتظر رہتی ہیں، اور جب وہ وقت و ہنگام آ جاتا ہے اس وقت نقاب استتار الٹتی ہیں اور بعض اس سے بھی ایک ممتد زمانہ تک آب بستہ کی طرح بے حس و حرکت پڑی رہتی ہیں

مذہب کے وجود کی یہ فلسفیانہ تاریخ خود فلسفہ کا ساختہ و پرداختہ ہے اور نہ مذہب اس وقت سے ہر حیثیت سے خود انسان سے

اور ساعت سیمین آتے ہی ان میں شورِ تلاطم پیدا ہوجاتا ہے، مثلاً بچہ کے پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے تمیز طبعی اس طرح اس کا ساتھ دیتی ہے کہ اس سے طلبِ غذا کا فعل صادر ہوتا ہے اور اپنی سابقہ حیات کے برخلاف اس کے اثر سے بے تکلف کام و دہان سے پہلے پہل کام لیتا ہے، حالانکہ اس سے پیشتر بطنِ مادر کے محبس میں کب اسے ایسی ضرورت پیش آئی تھی جو منہ اور گلے سے اسے کام لینے کا تجربہ ہوچکا ہوتا، یہ تمیز طبعی ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اس نے فوراً وقت کے وقت سب کچھ سکھا دیا، تمیز طبعی کے کنفِ حمایت میں آگے بڑھنے پر اور اور قوتیں تھوڑے تھوڑے وقفہ اور فاصلے سے معیت اختیار کرتی جاتی ہیں، یہانتک کہ وہ وقت آگیا کہ شباب کی رعنائیاں انگڑائیاں لینے لگیں یہ وہ موقع ہے کہ قوائے حیوانی کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی، اس کے بعد سے قوائے دماغی کی معجز نمائی کا آغاز ہوتا ہے مگر اس کی بھی یکساں حالت نہیں، ابتدا میں اس کا درجہ نہایت پست اور فروتر ہوتا ہے کیونکہ بربریت اور بہیمیت کے دور میں قوائے حیوانی کے استیلا اور غلبہ کے سامنے اس کی کچھ پیری نہیں چلتی، رفتہ رفتہ جب وحشت و جہالت کی تاریکی کے بعد تمدن اور تہذیب کی روشنی پھیلتی ہے تو اس کی کمزور اور دبی ہوئی طاقت ابھرتی اور اس کمی کی تلافی کا وقت آتا ہے جو پہلے سے چلی آرہی تھی، اور پھر کچھ زمانے کے بعد اسی کی فرمانروائی شروع ہوجاتی ہے تو معلوم ہوا کہ ازمنۂ مظلمہ کے آغاز میں انسان اپنے نشو و نما کے مراتب پورے کرکے کچھ نہ کچھ دماغ سے بھی کام لینے لگا تھا، دماغی کاروبار کا وقتی اثر و استعداد کے لحاظ سے اشیاے عالم کی تھوڑی بہت حقیقت شناسی سے آغاز ہوا، جس میں فلسفہ ضمیر مستتر کی طرح موجود ہے، وہی اولین درکِ حقائق جو انسان سے سرزد ہوا اس سے فلسفہ کی بو آتی ہے اور ایسے تاریک وقت میں اتنی حد بھی مغتنمات سے سمجھنے کے لائق ہے، بہ ظاہر ثبوت دعویٰ مذکور میں اب کسی قسم کی الجھن باقی نہیں کیونکہ طرق مختلفہ کے طرزِ تحقیق کا ماحصل یہی نکلتا ہے کہ فلسفہ آج کا نہیں ظہورِ تخلیق سے اس کی تاریخ کا آغاز ہے،

آلِ بویہ کی ابتدائی تاریخ کے مآخذ

از

جناب ڈاکٹر سعید حسن صاحب ایم اے (علیگ) پی ایچ ڈی لنڈن

عزیز کرم، ڈاکٹر سعید حسن صاحب ایم اے (علیگ) پی ایچ ڈی (لنڈن) جن کا تذکرہ اس سے قبل معارف کے شذرات مین آچکا ہے، بحمد اللہ ۴ سال مدرسہ اورینٹیل اسٹڈیز (لنڈن) سے انگلستان مین دو سال کے قیام اور بعض دیگر ممالکِ یورپ کے سفر کے بعد اسلامی تاریخ مین ڈاکٹریت کی سند لیکر اپنے وطن بلند شہر واپس آگئے ہین، اور اپنی زندگی کو تعلیمی و علمی مشاغل مین صرف کرنے کا تہیہ رکھتے ہین، خدا انھین ان کے نیک ارادون مین کامیاب اور ان کی ذات کو ملک و قوم کے حق مین مفید ثابت کرے،

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی ڈگری کے لئے ایک مقالہ آل بویہ (دیلمیان) کی ابتدائی تاریخ پر قلمبند کیا تھا، جو عنقریب شایع ہوگا،

یہ مقالہ حسب ذیل مباحث و ابواب پر مشتمل ہے:-

(ا) فہرست مآخذ و مصادر،

(ب) دیباچہ،

(ج) نقشہ،

۱- تاریخِ دیلم کے مآخذ پر تنقید و تبصرہ،

۲- آلِ بویہ کا نسب، ان کے ابتدائی حالات، اور ان کا عروج،

۳- رستے جبال اور عراق کی فتح،

۴- امیر معز الدولہ کے عہدِ امارت مین خلافتِ عباسیہ کی سیاسی حالت،

۵- اس عہد کے مذہبی تمدنی اور معاشی حالات،

ہماری استدعا پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے اس بیش بہا مقالہ کا باب اول جسمین تاریخ دیلم کے ماخذ و مصادر پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے، ترجمہ فرما کر معارف مین طبع ہونے کے لئے مرحمت کیا ہے،

یہ مضمون قیمتی و دلچسپ معلومات سے مملو ہے، اور ہمین یقین ہے کہ علم دوست ناظرین معارف اسے خاص طور پر پسند فرمائین گے،

"حسن برنی"

جہان تک میرا خیال ہے ابھی تک موجودہ محققون مین سے کسی نے آل بویہ کی جداگانہ تاریخ لکھنے کی کوشش نہین کی، صرف ولکنس نے تاریخ میرخواند سے آل بویہ کے متعلق واقعات اخذ کر کے بعنوان "تاریخ آل بویہ ماخوذ از تاریخ میرخواند" فارسی متن مع جرمن ترجمہ کے شایع کیا، ولکنس کی مذکورہ بالا تالیف چندان قابلِ قدر نہین، کیونکہ میرخواند کا وجود آل بویہ کے زوال کے ایک عرصہ کے بعد ہوا، علاوہ ازین میرخواند کا ماخذ تاریخ گزیدہ، جس کا میرخواند نے جابجا عموماً تذکرہ کیا ہے، بذات خود چندان باوثوق نہین مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن تاریخ گزیدہ کے مترجم عموماً اپنے احباب سے تاریخ گزیدہ کے زیادہ معتبر نہ ہونے کا تذکرہ کیا کرتے تھے،

آل بویہ کا عروج تاریخِ اسلام مین مختلف حیثیتون سے کافی اہمیت رکھتا ہے، جس زمانہ مین خاندان بویہ کا عروج ہوا خلیفہ کی زوال پذیر قوت اپنے قدیم مرعوب کن خطاب امیر المومنین کی صرف ایک آواز بازگشت رہگئی تھی، اسلامی دنیا اس زمانہ مین مختلف خود مختار سلطنتون مین منقسم ہوگئی تھی جنمین سے چند تو برائے نام ہی خلیفہ کو اپنا خلیفہ مانتی تھین اور بعض نے خود امیر المومنین کا خطاب جو اب تک صرف خلیفہ کی ذات تک مخصوص تھا اختیار کر لیا تھا، آل بویہ کا فارس و عراق اور فاطمیون کا مصر پر تسلط ہو جانے سے شیعیانِ علی قوت پکڑ گئے یعنی مرکزِ خلافت یعنی بغداد مین بھی شیعہ رسوم علانیہ ہونے لگے، چنانچہ شیعہ اور سنیون مین اسیمین تفرقہ پڑ گیا جس کا نتیجہ بغداد مین متعدد دنگا و [illegible] ہوئے جن کا تذکرہ بالتفصیل آیندہ کیا گیا ہے، بدقسمتی سے آل بویہ کی ابتدائی تاریخ کے بابت موجودہ اطلاع کے ذرائع، نہایت محدود اور غیر مسلسل ہین،

تین معاصر مورخون ثابت بن سنان ابو الاسحاق، ہلال الصابی اور ابن مسکویہ کی تالیفات مین سے صرف ابن مسکویہ کی تاریخ دستیاب ہوئی ہے،

الصابی کی زندگی کی بابت مفصل تذکرہ آیندہ کیا گیا ہے، ابن مسکویہ کے مفصل حالاتِ زندگی کا اس موقعہ پر تذکرہ کرنا چندان ضروری نہین، کیونکہ ڈاکٹر مارگولیتھ نے تجارب الامم کے انگریزی ترجمہ کی تمہید مین ابن مسکویہ کے حالات زندگی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہین، ابن مسکویہ نے آل بویہ کے مشہور وزرا مہلبی اور ابن العمید کی خدمت مین عرصہ تک مختلف ممتاز عہدون پر کام کیا تھا، چنانچہ ابن مسکویہ آل بویہ کے دربار اور ان کے مشہور وزیر سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اسے اس زمانہ کی تاریخ کے لئے نہایت باعتماد مورخ خیال کیا جاتا ہے،

لیکن ابن مسکویہ چشم دید واقعات ۳۴۲ھ کے بعد سے بیان کرتا ہے، جیسا کہ اس نے اپنی تاریخ مین خود بیان کیا ہے، اس سال کے بعد کے واقعات یا تو اس کے خود چشم دید ہین یا ان ثقہ لوگون کے بیانات سے ماخوذ ہین جنھون نے واقعات مین خود حصہ لیا ہے، (ابن مسکویہ جلد دوم صفحہ ۱۲۶) ۳۴۲ھ کے ماقبل کے واقعات کی بابت ابن مسکویہ خود بھی مذبذب ہے اور بہت شاذ اپنے ماخذ کا پتہ دیتا ہے، عموماً جابجا ابن مسکویہ نے ثابت بن سنان کا تذکرہ کیا ہے جس سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ابن مسکویہ کے جملہ ماخذ مین سے ایک ماخذ ثابت بن سنان ضرور ہے، مذکورۂ بالا صدی سے قبل کے ابن مسکویہ کے لکھے ہوئے واقعات کی اہمیت اس وجہ سے اور کم ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مختلف ماخذ کی کافی تصدیق کرنے مین قاصر ہے، جس کی وجہ سے ایک ہی واقعہ کو مختلف طریقہ پر دوبارہ بیان کر جاتا ہے، مثلاً ابن مسکویہ آل بویہ کے مرداویج کی ملازمت مین داخل ہونے کا تذکرہ جلد اول صفحہ ۲۸۰ پر کرتا ہے، اور پھر اسی واقعہ کو مختلف واقعات کے ساتھ مکرر صفحہ ۲۹۱ پر بیان کرتا ہے، علی ہذا القیاس ابن بویہ و یاقوت کی لڑائی کو بھی دو مختلف طریقے سے دو جگہ بیان کرتا ہے، (دیکھو ابن مسکویہ جلد اول صفحہ ۲۹۰ و ۲۹۷) بعض اوقات تاریخ مین بھی اختلاف ہے، مثلاً ابن سالار کے رے پر حملہ کرنے کا تذکرہ ۳۳۶ھ مین بیان کرتا ہے، اور مکرر اسی واقعہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ ۳۳۹ھ مین بیان کرتا ہے، حالانکہ یہ بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ ۳۳۹ھ بالکل غلط ہے، کیونکہ اس سال رکن الدولہ

ابن بویہ رے سے شیراز کو مراجعت کر گیا تھا تاکہ شیراز کی بغاوت جو اس کے بڑے بھائی عماد الدولہ ابن بویہ کی موت
کی وجہ سے سنہ ۳۳۸ھ میں ظہور پذیر ہوئی تھی فرو کر دے، ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ سنہ ۳۳۸ھ ہجری کے
قبل کے واقعات ابن مسکویہ نہایت پیچیدہ اور الجھے ہوئے طریقہ سے بیان کرتا ہے جن کا سلجھانا چنداں آسان کام
نہیں ہے، علاوہ برین رسائل صابی کا ایک قلمی نسخہ جو پیرس لائبریری میں موجود ہے، تاریخ آل بویہ کے آخری
حصہ پر کچھ روشنی ڈالتا ہے، لیکن جدا تاریخ لکھنے کے لئے چنداں مفید نہیں ہے،

دوسرے قابل وثوق مورخ امام ابن الجوزی ہیں، لیکن ابن الجوزی لڑائی وغیرہ کے بیان اس قدر تفصیل کیساتھ
بیان نہیں کرتے کہ ابن مسکویہ کے لکھے ہوئے واقعات کی تصحیح و تردید میں کچھ مدد مل سکے، ان ذرائع کے علاوہ میں نے
ان مقامات کی جداگانہ تاریخ کو بھی نہایت تنقیدی نگاہ سے مطالعہ کیا جہاں آل بویہ کا ایک عرصہ تک تسلط رہا ہے
لیکن نہایت مایوسانہ معترف ہونا پڑتا ہے، کہ یہ بھی چنداں مفید ثابت نہیں ہوا، تاریخ قم کا ایک دستی نسخہ مملوکہ برٹش
میوزیم مجھے دستیاب ہوا، یہ کتاب سنہ ۳۷۸ھ میں حسن بن حسن قمی نے آل بویہ کے مشہور وزیر صاحب ابن عباد کیلئے
لکھی تھی، اس کتاب کا ترجمہ سنہ ۸۰۵ھ میں بزبان فارسی ہوا چنانچہ فارسی کے ترجمے کے چند حصے نہایت خوشخط لکھے ہوئے
برٹش میوزیم میں موجود ہیں، لیکن اس کتاب کے موجودہ حصص بھی اوائل تاریخ بویہ کے لئے چنداں مفید نہیں،
صرف خراج کی بابت چند تغیرات کا پتہ چلتا ہے جن کا عمل درآمد رکن الدولہ اور اس کے وزیر صاحب ابن عباد نے
مذکورہ بالا شہر میں کیا تھا، ایک اور قلمی نسخہ مسمی "بہ شیراز نامہ" میں واقعات شیراز شروع سے سنہ ۷۴۴ھ تک درج
ہیں، لیکن آل بویہ کی بابت اس قدر اختصار سے کام لیا ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل
نہیں ہوتا، ابن اسفندیار مورخ تاریخ طبرستان قریب قریب ابن الاثیر کا ہم عصر تھا ظہیر الدین مرعشی نے ایک عرصہ کے
بعد ایک دوسری تاریخ طبرستان لکھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے قریب قریب تمام واقعات ابن اسفندیار سے لئے
ہیں، ابن اسفندیار اپنے ماخذ کا پتہ بالکل نہیں دیتا، اور بعض اوقات بیان واقعہ میں ابن الاثیر سے اختلاف کرتا ہے"
اور کبھی کبھی تاریخ بھی غلط بیان کر جاتا ہے، مثلاً ابن اسفندیار رقمطراز ہے کہ لیلی ابن نعمان الدیلمی جو طبرستان

کے فرماں روا سید ناصر کبیر کی طرف سے عامل تھا، سامانیوں سے بمقام طوس ہزیمت پاکر جرجان بھاگ گیا، اور اس نے
جرجان میں چند لوگوں کو جمع کر کے ناصر کبیر کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا، چنانچہ ابن اسفندیار کے مطابق لیلی ابن نعمان پہلا
دیلمی تھا جس کے سر میں بادشاہت کا خیال سمایا، (ابن اسفندیار صفحہ ۲۰۵) لیکن ابن الاثیر کے بیان کے مطابق لیلی ابن نعمان
بمقام طوس لڑائی میں کام آیا،

ابن اسفندیار کے بیان کے مطابق سامانیوں کے تحت کے باغی عامل محمد بن ہارون نے فرماں روایان طبرستان
و دیلم یعنی ناصر کبیر و جستان ابن وہسودان سے اتحاد کر کے سامانیوں کے گورنر ابو العباس سے سنہ ۲۹۹ھ میں جنگ کی اور شکست
اٹھائی، (ابن اسفندیار صفحہ ۱۹۰) تاریخ معرکہ کی تردید خود ابن اسفندیار کے بیان سے ہوجاتی ہے کیونکہ ابن اسفندیار نے آگے
چل کر لکھا ہے کہ ابو العباس نے سنہ ۲۹۸ھ میں انتقال کیا، اس سے صاف ثابت ہے کہ سنہ ۲۹۹ھ میں ابو العباس سے محمد بن
ہارون کا معرکہ آرا ہونا ناممکن ہے، ابن الاثیر نے ان واقعات کو مختلف طریقہ سے بیان کیا ہے، ابن اثیر کے بیان کے مطابق محمد بن
ہارون اسماعیل بن احمد سامانی منہزم ہوکر دیلم کے فرماں روا جستان ابن وہسودان کے پاس پناہ گزیں ہوگیا، سنہ ۳۰۰ ہجری میں
سامانیوں کے گورنر پارس نے محمد بن ہارون کو جستان بن وہسودان کے خلاف ترغیب دیکر اپنے پاس جرجان میں بلاکر مقید کر دیا
تین ماہ کے بعد محمد بن وہسودان نے بحالت قید انتقال کیا، (ابن الاثیر جلد ۸ صفحہ ۱۸۸) ابن الاثیر کا بیان زیادہ سلجھا ہوا اور
قابل قدر معلوم ہوتا ہے، ابن اسفندیار کے بیان کے مطابق ۲۰ ترکی مردمیدان ماکان بن کاکی پر حملہ آور ہوئے اور اسے گھوڑے
سے گرا کر قتل کر ڈالا، (ابن اسفندیار صفحہ ۲۱۶) برخلاف اس کے ابن الاثیر لکھتا ہے کہ ماکان بن کاکی پا پیادہ نہایت جوانمردی سے
عین مرکز کارزار میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہا تھا کہ اتفاقاً ایک تیر اس کی پیشانی پر لگا اور اس کے سر کے پار ہوگیا، اس کا نتیجہ ماکان
کی ہلاکت ہوئی، (ابن الاثیر جلد ۸ صفحہ ۱۳۰) رکن الدولہ ابن بویہ کے رے کے حملہ کی بابت بھی دونوں مورخین میں کافی اختلاف
ہے، ابن اسفندیار نے نہایت پیچیدہ اور دشوار طریقہ سے ان واقعات کو بیان کیا ہے ابن اسفندیار کے بیان کے مطابق
رکن الدولہ بن بویہ کرمان سے عراق (شاید ابن اسفندیار کا مطلب عراق عجم ہے)، روانہ ہوا، وشمگیر برادر مرداویج نے رے
سے دو منزل کے فاصلہ پر رکن الدولہ کا مقابلہ کیا اور شکست دی، رکن الدولہ کی ہزیمت کے بعد وشمگیر ژند آیا اور ماکان کو

طلب کرکے نہایت تعظیم وتکریم کے بعد ساری بھیجا اسی اثنا میں وشمگیر کو خبر لگی کہ خراسانیوں کا گورنر ابوعلی ابن محتاج رے پر حملہ کرنے کے قصد سے روانہ ہوا، چنانچہ وشمگیر ماکان سے مدد کا طالب ہوا، ماکان حسن ابن فیروزان کو ساری چھوڑ کر وشمگیر کی مدد کو آیا، اسحاق آباد میں میدانِ جنگ گرم ہوا، اور ماکان اس میں کام آیا، (ابن اسفندیار صفحہ ۲۱۸ و ۲۱۹) برخلاف اس کے ابن الاثیر بیان کرتا ہے کہ ابن محتاج جرجان پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا، وشمگیر نے اپنی افواج کو ماکان کی مدد کے لئے روانہ کیا، وشمگیر کی افواج کے روانہ ہونے کی خبر سنکر رکن الدولہ نے اصفہان کی طرف مراجعت کی اور اس پر قبضہ کرلیا بعد ازآں رامہرمز پر بھی قبضہ کرلیا، رکن الدولہ ابن بویہ اور عماد الدولہ ابن بویہ نے بعدہٗ ابوعلی ابن محتاج کو رے پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی اور یہ وعدہ کیا کہ یہ دونوں بھائی اس کی اعانت کریں گے، ابوعلی بن محتاج رکن الدولہ سے متحد ہوکر وشمگیر کے خلاف روانہ ہوا، وشمگیر نے ماکان سے اتحاد کرکے اسحاق آباد پر مقابلہ کیا، وشمگیر کو شکست ہوئی اور ماکان لڑائی میں فوت ہوگیا، (ابن الاثیر جلد ۸ صفحہ ۱۳۰) باوجود اختلافات اور پیچیدہ طرز بیان کے ابن اسفندیار شروع تاریخ آل بویہ کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے،

ابن اسفندیار سے ہی پتہ چلتا ہے کہ آل بویہ نے اپنی زندگی طبرستان کے سید فرماں روایان کی خدمت سے شروع کی، ماکان ابن کاکی کے بھائی سے بھی ایک مرتبہ برسرپیکار رہنے کا پتہ چلتا ہے، جس کا تذکرہ کسی اور مورخ نے نہیں کیا، ابن الاثیر کو باوجود متاخر ہونے کے میں اہم وکافی قابل قدر سمجھتا ہوں اسمیں مطلق شک نہیں کہ ابن الاثیر کے جملہ ماخذ میں ایک ماخذ ابن مسکویہ کی تاریخ تجارب الامم ہے، ابن الاثیر خود اس کا معترف ہے، معلوم ہوتا ہے، کہ ابن الاثیر نے لڑائیوں کے واقعات تجارب الامم سے اختصار کرکے اپنی تاریخ میں درج کئے ہیں بعض اوقات تجارب الامم کے لفظ تک بجنسہ اعادہ کردیئے ہیں، لیکن ابن الاثیر واقعات کو نہایت سلجھا کر بیان کرتا اور ابن مسکویہ کے دو مختلف بیانات میں سے صرف ایک پر اکتفا کرتا ہے، اس کی وجہ شاید یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابن الاثیر نے مورخوں کے بیانات کی تصدیق میں کافی جدوجہد سے کام لیا ہے، اور صرف ان ہی واقعات کو جنکی صداقت پر اس کو کافی یقین تھا درج کیا ہے، نہ تو ابن مسکویہ اور نہ ابن الاثیر اپنے ماخذ کا صاف صاف پتہ دیتے ہیں، چنانچہ اس حالت میں ابواسحاق ابراہیم بن ہلال الصابی و ثابت بن سنان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ابن مسکویہ اور ابن الاثیر کے جملہ ماخذ کا پتہ لگانا قطعاً ناممکن معلوم ہوتا ہے، ابن مسکویہ

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، ثابت بن سنان کا بالعموم تذکرہ کرتا ہے، جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابن مسکویہ کا ایک ماخذ ثابت بن سنان بھی ہے،

ابن الاثیر نے ثابت بن سنان کا تذکرہ نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن الاثیر نے ثابت بن سنان سے واقعات اخذ نہیں کئے، بلکہ ابن مسکویہ سے اخذ کئے ہیں، کیونکہ کبھی کبھی ابن مسکویہ کا تذکرہ ابن الاثیر کرتا ہے، لیکن ابن الاثیر کا ماخذ صرف ابن مسکویہ ہی نہیں ہے، بلکہ بعض دیگر ماخذ کا بھی پتہ لگتا ہے، ابن الاثیر نے بغداد میں شیعہ سنیوں کا تفرقہ اور ان مصائب کا جنکا دورانِ امارت معز الدولہ میں بغداد آماجگاہ بنا ہوا تھا، ابن مسکویہ سے زیادہ مفصل طور پر بیان کئے ہیں، اور قریب قریب ابن الجوزی اور سبط ابن الجوزی سے بالکل متفق ہیں، قدرۃً اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ابن الاثیر کا ماخذ ابن الجوزی بھی ہے،

ابن الاثیر کے بیان کے مطابق ابن ماکولا کی تصنیف کردہ کتاب الاکمال بھی اس کا ایک ماخذ معلوم ہوتی ہے، (جلد ۸ صفحہ ۱۷۶ و ۱۹۱) ان دونوں صفحات پر اس نے ابن ماکولا کا حوالہ دیا ہے، اور ابن مسکویہ سے موازنہ کرتے ہوئے ابن ماکولا کو زیادہ ثقہ قرار دیا ہے، ابن ماکولا کا دوسرے مورخ، مثلاً ابن خلدون جس کا مقدمہ طرز تاریخ نویسی میں نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے، نہایت عزت سے ذکر کرتے ہیں، بہر حال الصابی اور ثابت بن سنان کی عدم موجودگی میں صرف اس قدر کہا جاسکتا ہے، کہ علاوہ دیگر ماخذ کے ابن الاثیر کے ماخذ میں ابن ماکولا، ابن مسکویہ اور ابن الجوزی بھی ہیں، ابن الاثیر کی اہمیت نظر انداز نہیں کیجاسکتی کیونکہ علاوہ ان ماخذ سے مستفید ہونے کے ابن الاثیر کی عادت ہے کہ خود بھی اپنی رائے کا گاہے گاہے اظہار کرتا ہے، جس کا رواج قدیم مورخوں میں بہت شاذ ہے، بہر حال میں نے ہر موجودہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ ماخذ کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور حتی الوسع کوشش کی ہے کہ کوئی ماخذ بھی جو دستیاب ہوسکے نظر انداز نہ ہوجائے، ابن مسکویہ کے پیچیدہ بیانات کی دیگر کتب عربی و فارسی و انگریزی و جرمنی وغیرہ سے جہاں تک ممکن ہوا تائید و تردید کرنے کی کوشش کی ہے،

خاندان بویہ کے نسب سے ایک جدا باب میں بحث کی ہے جسمیں جملہ مصنفین کے بیانات پر تنقید بھی کی گئی ہے،[1]

[1] معارف: معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے ابن خلکان کو کیوں نظر انداز کیا، اس کے مختصر بیانات جو اصل ماخذ سے ماخوذ ہیں اہم ہیں، لیکن سب سے زیادہ اہم اس زمانہ کے سفرنامے ہیں، جنمیں سے ابن حوقل، اصطخری اور بشاری کی بریرۂ جغرافی بھی مفید ہوگی، عجب نہیں کہ ڈاکٹر صاحب ادھر بھی توجہ کی ہو گو تمدنی صنعتی اور تجارتی مذہبی اغراض کے لئے ان میں مفید معلومات ہیں،

ابن رشیق صقلیہ میں

اور

ایک غلط واقعہ سے غلط استنباط

از

مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

ابن رشیق صقلیہ میں

صقلیہ (سسلی) دور اسلامی میں اپنی علمی ترقیوں کے باعث علوم وفنون کا ایک خاص مرکز بن گیا تھا، اور بقول صاحب تحفۃ الدہر "اس کی سرزمین اپنی علمی فضا کے اعتبار سے سرزمین اندلس کی بہن تھی" کچھ اس فضا کی کشش اور کچھ یہاں کے مسلمان فرماں رواؤں کی بالعموم علم دوستی کے باعث مختلف ممالک کے ارباب علم وفضل کھنچ کھنچ کر صقلیہ پہونچے اور بہتوں کو ایسی وابستگی ہوئی کہ یہیں کے ہو کے رہ گئے، اور ان کا شمار "متوطنین صقلیہ" میں ہوا، اور پھر اسی خاک کے پیوند ہوئے، چنانچہ عربی علم ادب کی مشہور کتاب کتاب العمدہ کا مصنف ابو علی حسن بن رشیق قیروانی بھی اسی جماعت میں داخل ہے،

زمانۂ قدوم میں اختلاف اور مولانا میمنی کی تحقیق

لیکن اس کے صقلیہ آنے کے زمانہ میں اختلاف ہے، اور اسی اختلاف کی بنا پر اس کی صقلیہ کی زندگی کے علمی مشاغل بھی زیر بحث آجاتے ہیں، ہندوستان کے مشہور ادیب مولانا عبد العزیز صاحب میمنی راجکوٹی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے معارف جلد ۱۳ کے کئی نمبروں میں "ابن رشیق اور المعز، اور تاریخ قیروان کا ایک صفحہ" کے عنوان سے تحقیقی سلسلۂ مضامین شائع فرمایا ہے، جسمیں اس بحث پر بھی روشنی ڈالی ہے، موصوف نے اس موقع پر ابن بسام کی ایک روایت اختیار فرما کر اس کے صقلیہ میں آنے کا زمانہ سنہ ۴۵۱ھ متعین فرمایا ہے

اور اس سے اس نتیجہ تک رہنمائی فرمائی ہے کہ:-

"(۱) یہاں اگر اس نے کوئی قابل ذکر علمی کام نہیں کیا، کہ یہ اس کی پیری و پریشانی کا زمانہ تھا، (۲) یہاں کے ملوک یعنی آل حسن بن علی اس سے پیشتر ہی باہمی خانہ جنگیوں اور رومیوں کے حملوں سے زندگی کے آخری دم گذار رہے تھے، اور اس وقت تک رجار صاحب البلطہ نے سسلی کا بیشتر حصہ فتح کر لیا تھا، ممکن ہے انھیں پیاپے حملوں میں وہ بے موت مرا ہو، (۳) حالات لکھنا تو کون، سسلی کے ہر کلمہ گو کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوے تھے"

ابن بسام کی روایت

ابن رشیق کی صقلی زندگی کے متعلق یہ تمام نظریئے صرف ابن بسام کی ایک روایت پر قائم کئے گئے ہیں، اس لئے اس روایت نے ایک خاص اہمیت اختیار کر لی ہے، روایت ابن فضل اللہ العمری کی کتاب مسالک الابصار میں منقول ہے، جس کا ترجمہ مولانا کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:-

"ایک شام کے بعد مہدیہ پر رومیوں کا بیڑا آدھمکا اور سمندر میں قیامت خیز طوفان بپا کر دیا، جب قریباً پو پھٹنے کا وقت ہوا تو ابن رشیق المعز کے یہاں پہونچا، دیکھا وہ جا نماز پر بیٹھا ہے، عرضیاں گذاری جا رہی ہیں، اور شمع روشن ہے، اور اس نے پہونچتے ہی اپنا بائیہ قصیدہ چھیڑ دیا جس کا مطلع ہے

تثبت لا یخامرک اضطراب   فقد خضعت لعزتک الرقاب

ثابت قدم رہ تجھے اضطراب لاحق نہ ہو   کہ تیری عزت کے سامنے گردنیں جھک گئیں

المعز نے کہا بس بس، تم نے مجھے کب غیر مثبت پایا تھا، جب کلام ایسا ہی بارد ہو تو پھر ہماری طرح سے خاموش کیوں نہیں ہو رہتے، پھر حکم قصیدہ والے رقعہ کو پارہ پارہ کر ڈالا، اور اس پر ہی قناعت نہیں کی، بلکہ شمع کے قریب لا کر اس کو جلا ڈالا .... تو ابن رشیق اندھا دھند سسلی کی طرف منہ کئے روانہ ہو گیا[۱]"

مہدیہ پر نصاریٰ کا حملہ

ابن بسام کی اس روایت میں چند امور خاص طور پر تنقیح طلب ہیں، جنکو ہم نے زیر خط کر دیا ہے

[۱] معارف جلد ۱۳ نمبر ۴ صفحہ ۲۸۲،

جس کے بعد معلوم ہوگا کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو مہدیہ میں پیش آیا یا کہیں اور، المعز بن بادیس صحیح یا غیر صحیح روایت کے بموجب خواہ ۴۴۹ھ میں مہدیہ آیا[1] یا ۴۵۱ھ یا ۴۵۲ھ میں وہاں پہونچا[2] اور اسی طرح اس کا سنہ وفات تمام اختلافات کو سامنے رکھکر ۴۵۳ھ سے ۴۵۵ھ تک قرار دیا ہے، اور اگرچہ ابن عذاری وغیرہ نے اس کے قیام مہدیہ کی مجموعی مدت صحیح طور پر بتصریح دو برس سے بھی کم بتائی ہے، لیکن اگر ان تمام مورخین کے اختلافات کو لیکر اس کے قیام مہدیہ کی طویل سے طویل مدت نکالی جائے تو وہ ۴۴۹ھ سے ۴۵۵ھ تک سات سال نکلتی ہے، اس لئے اگر المعز کے زمانہ قیام میں مہدیہ پر نصاریٰ کا کوئی بحری حملہ ہوا تو انھیں سنوں میں سے کسی سنہ میں پیش آیا، لیکن اس وقت ہمارے سامنے عام تاریخوں کے ماسوا ایسی شائع شدہ تاریخیں بھی ہیں جو خاص مغرب اور شمالی افریقیہ پر لکھی گئی ہیں، مگر ہمیں اس ہفت سالہ مدت میں ان میں سے کسی تاریخ میں کوئی ایک ٹکڑا بھی ایسا نہیں ملا کہ ابن بسام کے بقول رومیوں نے المعز کی موجودگی میں مہدیہ پر کوئی بحری حملہ کیا ہو، البتہ المعز کی وفات کے تئیس چوبیس برس بعد تمیم بن المعز کے عہد میں ۴۸۰ھ میں جبکہ تمیم مہدیہ سے باہر تھا، ساحل مہدیہ پر رومیوں کے جنگی جہاز آئے اور فوجیں اتر پڑیں، اور اس کا تذکرہ کم و بیش اکثر کتابوں میں موجود ہے،[3]

المعز کی حکومت سے کنارہ کشی

اس کے علاوہ ابن بسام کی روایت میں ہے کہ جب ابن رشیق نے اپنا قصیدہ پڑھا ہے، اس وقت "المعز کے سامنے عرضیاں گذاری جارہی تھیں"، گویا مہدیہ میں بھی زمام حکومت المعز کے ہاتھ میں تھی، حالانکہ تاریخی طور پر یہ مستند ہے کہ المعز نے مہدیہ پہونچتے ہی اپنی زندگی ہی میں عنان حکومت اپنے لڑکے تمیم کے سپرد کردی جو پیشتر سے مہدیہ کا والی تھا، اور خود حکومت سے کنارہ کش ہوگیا، چنانچہ ابن ابی دینار بہ تصریح لکھتا ہے،

فلما وصل (المعز) الی المھدیۃ تلقاہ ولدہ تمیم وترجل لہ	جب المعز مہدیہ پہونچا تو اس کے لڑکے تمیم نے اس کا پیدل
وقبل یدہ وادخلہ البلد فسلم الامر الی ولدہ تمیم	چل کر استقبال کیا، ہاتھوں کو بوسہ دیا، اور اس کو شہر میں

[1] کتاب المونس ص ۸۸، ابن خلدون ج ۶ ص ۱۵۹، [2] تاریخ مغرب لابن عذاری (اردو) ص ۱۶۷،

[3] ابن خلدون ج ۶ ص ۱۶۰ وغیرہ،

فی حیاتہ فقام بامور الدولۃ احسن	داخل کیا، تو اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لڑکے کو حکومت
قیام[1]	سپرد کر دی، اور اس نے نہایت خوبی سے سلطنت کا انتظام کیا،

ابن رشیق کے صقلیہ جانے کا صحیح سنہ

ان حالات میں اگر نفس واقعہ کی صداقت پر کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا، تو کم از کم اس کا مہدیہ میں وقوع پذیر ہونا بالکل مستبعد ہے، بلکہ روایت کے طرز بیان سے شبہہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جبکہ المعز منصوریہ میں مقیم تھا، اور عرب اس کی ایک سیاسی غلطی سے فائدہ اٹھاکر قیروان میں داخل ہوکر قتل و غارتگری میں مصروف ہوگئے اور المعز اس درجہ قریب رہکر اس کا کوئی انسداد نہ کرسکا،[2] اور ابن رشیق نے اس موقع پر اس کو "اضطراب" انگیز مصائب میں مبتلا دیکھکر "ثبات قدم" کی تلقین کرنا چاہی، مگر المعز کی شاہانہ خودداری کو اس سے صدمہ پہونچا، اور اس کا قصیدہ پارہ پارہ کرکے نذر آتش کر دیا گیا،

اس موقع پر ابن خلکان کا نہایت صاف، سادہ اور رنگ آمیزی سے پاک بیان نہایت توجہ کے قابل ہے، وہ ابن رشیق کے صقلیہ جانے کے متعلق لکھتا ہے:

ولم یزل بھا ای بالقیروان الی ان ھجم العرب	وہ قیروان میں مقیم رہا یہاں تک کہ عربوں نے قیروان
القیروان وقتلوا اھلھا واخربوھا فانتقل الی	پر حملہ کیا، وہاں کے باشندوں کو قتل کیا، اور اس کو ویران
جزیرۃ صقلیہ واقام بمازر[3]	کردیا، تو اب وہ جزیرہ صقلیہ میں آیا اور مازر میں قیام کیا،

ابن خلکان کی اس روایت کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھجاتی ہے، جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابن بسام کی منقولہ بالا روایت کو دیکھنے کے باوجود قابل اعتنا نہیں سمجھا، اور اس روایت کو نظر انداز کرکے اس کی کتاب الذخیرہ سے صرف چند شعر نقل کرلے جیسا کہ لکھا ہے،

ومن شعرہ علی ما حکاہ ابن بسام فی الذخیرۃ	اور اس کے اشعار میں سے چند یہ شعر ہیں جیسا کہ ابن بسام نے کتاب الذخیرہ میں نقل کیا ہے،

[1] کتاب المونس ص ۸۸، [2] ابن خلدون ج ۶ ص ۱۴۳، [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۶

بہر حال ابن خلکان کی اس واضح روایت کی وجہ سے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ قیروان کی بربادی کے بعد وہاں سے نکلا، اور اگر ابن بسام کی روایت میں سے نفس واقعہ کو ملا لیا جائے، تو پھر قیروان کے ایک مخصوص حصہ منصوریہ[1] سے اس کا صقلیہ جانا طے پاتا ہے، اس لئے ابن رشیق کی صقلیہ کو روانگی اسی سنہ میں پیش آئی، جو قیروان کی بربادی کا سال ہے، اور صحیح روایت کے بموجب قیروان کی بربادی کا واقعہ، اردی الحجہ ۴۴۹ھ میں پیش آیا[2]، اس لئے ۴۴۹ھ کی آخری تاریخوں میں اور یا ۴۵۰ھ کی ابتدائی تاریخوں میں وہ صقلیہ پہونچ چکا تھا،

وفات: ابن رشیق کی وفات اگرچہ ایک روایت میں ۴۵۶ھ میں بیان کیجاتی ہے، اور مشہور مستشرق گبریلینی نے اپنے مقالہ میں اسی کو اختیار کیا ہے[3]، لیکن ہمارے سامنے اس کے متعلق ابن خلکان کی تردید موجود ہے، اس نے اس روایت کی تردید کر کے سنہ وفات ۴۶۳ھ کو قرار دیا ہو، چنانچہ لکھتا ہے:-

وتوفی سنۃ ثلاث وستین واربعمائۃ..	اس نے ۴۶۳ھ میں وفات پائی اور بعض اہل فضل کا مکتوب
... ورأیت بخط بعض الفضلاء انہ توفی	میں نے دیکھا ہے کہ اس نے ۴۵۶ھ میں مازر میں وفات
سنۃ ست وخمسین واربعمائۃ بمازر والاول اصح	پائی لیکن پہلی روایت صحیح ہے،

اس لئے ابن خلکان کے مختتم قول کے لحاظ سے صقلیہ میں ابن رشیق کی مجموعی مدت قیام ۴۴۹ھ سے ۴۶۳ھ تک انیس برس قرار پاتی ہو، یعنی وہ ۵۹ سال کی عمر میں صقلیہ پہونچا اور ۷۳ برس کی عمر میں وہاں وفات پائی،

اس عہد کے سیاسی حالات اور ان کا اثر اسکے علمی مشاغل پر، اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس کے اثنائے قیام میں صقلیہ کے داخلی حالات کیا تھے، اور ان کا اثر اس کی صقلی زندگی کے علمی مشاغل پر کیا پڑ سکتا ہے،

اس عہد کی اسلامی تاریخ کا تمام تر خلاصہ یہ ہے کہ اس کے قدوم سے پیشتر ہی دولت کلبیہ کے زوال کے بعد طوائف الملوکی

[1] قیروان اور منصوریہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جیسے فاطمیین کے عہد میں مصر میں قاہرہ کو اور اسی طرح صقلیہ میں بلرم اور خالصہ کو، جس طرح خالصہ اور قاہرہ دار الحکومت تھا اسی طرح اس عہد میں منصوریہ دار الحکومت تھا جو ایک اعتبار سے قیروان کا ایک حصہ تھا اور ایک اعتبار سے مستقل ایک شہر کی حیثیت رکھتا تھا، [2] تاریخ مغرب لابن عذاری ص [illegible]، [3] مجموعہ مضامین بیادگار اماری ج [illegible] ص [illegible]، [4] ابن خلکان ج ۱ ص [illegible]،

قائم ہو چکی تھی، اور جو صوبہ جس کے پاس تھا وہ اسکو دبا بیٹھا تھا، اور اس سلسلہ میں اسکے جائے قیام مازر (Mazara) اطرانس (Trapani) اور نوطس (Noto) وغیرہ پر عبد اللہ بن منکوت کا قبضہ ہوا اور اسی اثنا میں وہی مسینی (Messina) اور والی قصریانہ (Castro-Giovanni) وغیرہ میں آویزش ہوتی ہے، نارمن فرماں روا رجار کو موقع ملتا ہے اور وہ صقلیہ کے مشرقی ساحل مسینی پر ۴۵۳ھ میں قبضہ کر لیتا ہے، اس کے بعد رجار کی تمام پیش قدمی مسینی ہی کے گرد و نواح میں جاری رہی، یہاں تک کہ ۴۶۱ھ آ پہونچا، اور ایوب بن تمیم صقلیہ کی خانہ جنگیوں سے مایوس ہو کر افریقیہ واپس چلا آیا، تو اس کے بعد رجار کو مزید پیش قدمی کا حوصلہ ہوا، اور مغربی صوبوں میں سے بلرم کو ۴۶۳ھ میں زیر نگیں کیا، اور اس کے بعد اطرانس اور مازر وغیرہ کی طرف رخ کیا،

اس لئے ابن رشیق کی وفات کے ایک سال بعد تک صقلیہ کے مغربی علاقے نارمنوں کی دار و گیر سے محفوظ تھے، پھر یہ شبہ کہ ممکن ہے وہ انھیں پیاپے حملوں میں بے موت مرا ہو، قطعی مستبعد ہے، اس کے اثنائے حیات تک نارمنی سیلاب صوبہ مسینی سے آگے نہ بڑھ سکا، مسلمان فرماں رواؤں کی جو کچھ خانہ جنگیاں تھیں، وہ جرجنت (Girgenti) اور قصریانہ (   ) میں برپا تھیں، مازر سب سے دور افتادہ مقام مغربی ساحل پر پڑتا تھا، ہاں یہ ممکن ہے صقلیہ کے مشرقی علاقوں کی بے چینی کا اثر مازر پر پڑتا، لیکن فلسفۂ تاریخ کی یہ ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ جب کوئی متحدہ حکومت ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، اور اگر اس کے کسی ایک ٹکڑے پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو اس کے دوسرے ٹکڑے بالکل غیر متاثر رہکر خاموش رہتے ہیں، ورنہ نہ وہ متحدہ حکومت ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی، اور نہ پھر تقسیم ہو کر ایک ایک کر کے انفرادی طور پر کسی تیسری طاقت کے قبضہ میں جاتی، ہر جگہ یہی ہوا کیا ہے، اور یہی صقلیہ میں پیش آیا، اگر کچھ اثر پہونچا بھی تو مسینی کے قریبی مقامات قصریانہ وغیرہ پر، جو سب کے سب مشرق میں واقع ہیں، اور مازر صقلیہ کے سب سے مغرب میں ہے، مسینی اور مازر کے درمیان تقریباً سو میل کا فاصلہ ہو، اس لئے ان حالات میں مازر کا مسینی کی ہنگامہ آرائیوں سے متاثر ہونا بالکل ناقابلِ یقین ہو،

ان حالات میں یہ سمجھنا کہ "اس نے یہاں اگر کوئی قابلِ ذکر علمی کام انجام نہیں دیا"، نہایت حیرت انگیز ہے، جب کہ

اس کی زندگی کے انیس سال یہاں بسر ہوئے، اور خصوصاً جبکہ یہ کہا جاتا ہے، کہ اہل علم کی زندگی کی آخری بہاریں کمالِ شباب پر ہوتی ہیں،

تالیفات البتہ یہ سوال غایت درجہ دشوار ہے، کہ اس کی تصنیفات زرسائل، قصائد اور نظموں میں سے کون چیزیں صقلیہ میں لکھی گئیں، اور کون چیزیں اس کے ورودِ صقلیہ سے پہلے اس کے قلم سے نکل چکی تھیں، کیونکہ اس کی تصنیفات میں سے بہت کم کے متعلق بہ تصریح معلوم ہے، کہ وہ فلاں مقام پر تالیف ہوئیں، بجز اس کے کہ اس کی مشہور کتاب العمدہ کے متعلق بہ تعیین اور بعض رسائل کے متعلق بہ گمان غالب کہا جا سکتا ہے کہ وہ ورودِ صقلیہ سے پہلے کی تصنیفت ہیں، اس کے علاوہ اس کی جتنی تصنیفات ہیں وہ مقامِ تصنیف کے لحاظ سے سب کی سب مشتبہ ہیں، اور ان کے متعلق غالب گمان یہی ہوگا کہ ان کی جائے تصنیف صقلیہ ہی ہے، کیونکہ اس کے مولد مہدیہ اور قیروان کی زندگی کا بیشتر حصہ العمدہ کی تالیف میں بسر ہوا، اور العمدہ کے بعد کی جو تصنیفات ہیں ان میں سے انموذج اور قراضۃ الذہب کے متعلق تو خود مولانا میمنی کو یہ شبہہ ہوتا ہے کہ شاید مہدیہ یا صقلیہ میں لکھی گئی ہوں، اس لئے اگر یہ قیروان کی بربادی کے بعد کی تالیفات ہیں تو پھر قیام مہدیہ ثابت نہیں، اس لئے ان کا مقامِ تصنیف صقلیہ کا متعین ہو جانا کچھ مستبعد نہیں ہے، ان کے ماسوا اس کی دیگر تصنیفات کے متعلق یہ عام خیال پیش نظر رکھنا چاہئے، کہ ہر اہل قلم کی بیشتر کتابیں اس کے آخر عمر کا ثمرہ ہوتی ہیں،

نظم و قصیدہ باقی رہیں اس کی نظمیں اور قصیدے تو ان میں سے چند کے متعلق بہ تصریح معلوم ہے کہ وہ صقلیہ میں لکھی گئیں، جس کے دیباچہ کے طور پر ہم اس نظم کو پیش کر سکتے ہیں، جو صقلیہ جاتے ہوئے سمندر کی لہروں میں جہاز پر بیٹھ کر قلمبند ہوئی جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

ولقد ذکرتک فی السفینۃ والردی　　　متوقع بتلاطم الامواج

اس کے بعد جب وہ صقلیہ پہونچا تو مازر سے اپنے قدیم صقلی دوست ابو عبد اللہ محمد بن علی بن الصباغ الکاتب کو اپنے ورودِ صقلیہ کی اطلاع نظم کر کے ارسال کی، عماد الدین الکاتب نے اپنے خریدہ میں اس کو نقل کیا ہے،

اس نے صقلیہ کی مدح میں بھی ایک نظم لکھی تھی جس کے دو شعر ابن شباط سے مل سکے ہیں،

اخت المدینۃ فی اسم لا ینشار کہا　　　فیہ سواہا من البلدان والتمس

وعظم اللہ معنی لفظہا قسما　　　قُل اذا شئت اہل العلم وفقس

جب صقلیہ میں ۴۵۳ھ میں المعز بن بادیس کی وفات کی خبر پہونچی تو اس کو بھی اپنے محسن کی کرم فرمائیاں یاد آئیں، اور وفورِ جذبات میں ایک مرثیہ لکھا، ابن اثیر نے اس کو نقل کیا ہے، اس کا مطلع یہ ہے،

لکل حی وان طال المدی ہلک　　　لا عز مملکۃ یبقی ولا ملک

مولانا میمنی کے ذوقِ ادب کی بدولت ابن رشیق اور اس کے ساتھ ابن شرف کے کلام کا مجموعہ "النتف من شعر ابن رشیق و زمیلہ ابن شرف" کے نام سے ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے، جس میں مذکورۂ بالا نظمیں بھی موجود ہیں، ان کے علاوہ اس میں ایسی متعدد نظمیں بھی ہیں جنمیں "شباب کی یاد"، "عہد پیری پر ماتم"، "معاصی کی یاد اور قیامت میں ان کی پرسش کا خوف" وغیرہ جیسے خیالات ادا کئے گئے ہیں، ہمیں اس قسم کی تمام نظموں پر اس حیثیت سے غور کرنا چاہئے کہ بالعموم یہ خیالات شاعر کے قلم سے عہد پیری ہی میں ادا ہوتے ہیں، جب شباب کی لغزشیں رہ رہ کر دل کو ٹھیس لگاتی ہیں، اور موت کا تصور بار بار سامنے آتا ہے، اور پھر حشر و نشر کا نقشہ بھی سامنے کھنچ جاتا ہے، ابن رشیق کے یہ دو شعر پڑھئے،

ولم اجد فی کتابی غیر سیئۃ　　　تسوؤنی وعسی الاسلام یسلم لی

"میں اپنے نامۂ اعمال میں بجز برائیوں کے اور کچھ نہیں پاتا، جو میرے لئے نقصان رساں ہیں، شاید اسلام مجھے اپنے پناہ میں لے"،

رجوت رحمۃ ربی وہی واسعۃ　　　ورحمۃ اللہ ارجی لی من العمل

"میں اپنے پروردگار کی رحمت کا خواستگار ہوں، جو سب کے لئے وسیع ہے، اور اللہ کی رحمت تو اعمال سے زیادہ پر امید ہے"۔

کیا یہ پیری کے تاثرات نہیں، ؟ پھر اگر صاحب بساط نے ان کے متعلق یہ دعوی کیا کہ یہ نظم اثنائے قیام صقلیہ کی ہے تو اس نے کیا برا کیا، لیکن مولانا فرماتے ہیں،

وادعی صاحب البساط انه قالها فی اٰخر حیاته ولا اراه صوابا اذ لم ینقل الینا من اخبارہ بصقلیه شیئ

صاحب بساط کا دعویٰ ہے، کہ اس نے اس کو آخری زندگی میں کہا ہے، لیکن میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا، کیونکہ ہم تک ابھی صقلیہ کے حالات میں سے کچھ نہیں پہونچا،

اگر اس کے صقلیہ کے حالات معلوم نہیں تو قیرواں کے کون سے حالات معلوم ہیں، خصوصاً جس طرح اس کے قصیدوں اور نظموں میں سے چند کے متعلق اگر متعین طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ قیرواں کی ہیں، تو چند کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ صقلیہ کی ہیں، اس لئے اگر یہ متعین کرنا ہے کہ کون نظم کہاں قلمبند ہوئی تو بجز ان نظموں کے اشعار کے مفہوم سے قیاسات قائم کرنے کے ہمارے پاس اور کون سا ذریعہ علم ہے، اور پھر اگر کسی نظم کے متعلق کوئی معتبر شہادت ملتی ہو، کہ وہ فلاں جگہ لکھی گئی، اور اس نظم کے اشعار بھی اس کے موید ہیں، تو پھر کیوں نہ تسلیم کریں،

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری،

اور

علم حدیث

از

جناب مولانا شاہ نجم الدین صاحب خانقاہ بہار شریف

جناب مولانا! السلام علیکم، ماہ نومبر ۲۸ء کے معارف میں حضرت سلطان المحققین مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری بہاری قدس سرہ کا ذکر خیر بھی آگیا ہے، ہم بہاریوں کے لئے حضرت مخدومؒ کے احوال سے تھوڑی بیخبری بھی لحاظ کے قابل ہے، علاوہ ازیں معارف ایک علمی اور تاریخی رسالہ ہے اس میں کسی قسم کی فروگذاشت کو دل پسند نہیں کرتا، خود آپ بھی اس خیال کے آدمی نہیں، کہ بزرگانِ دین کو محدث سمجھنے میں تامل فرمائیں، چنانچہ آپ کی تحریر اس کی شاہد ہے، اس لئے صرف اظہارِ واقعہ کے طور پر اس بات کو پیش کرنا ہے، کہ حضرت مخدومؒ کی نظر صرف کسی مجموعہ پر حدیث شریف کے نہ تھی بلکہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع صغیر، مسند ابو یعلی، مشارق الانوار، شرح مصابیح، و دیگر کتب احادیث سب پر تھی، بہر حال حدیث شریف کی جتنی کتابیں اس دیار میں معتبر اور معروف تھیں سبھوں کا حضرت مخدومؒ نے خوب گہرا مطالعہ کیا تھا، اور فن حدیث سے اچھی طرح واقف تھے،

اسناد ملاحظہ ہوں

خوان پر نعمت مجلس سی و یکم، ا شیخ وحید الدین خواہر زادہ سید نجیب الدین فردوسی عرض داشت، کہ در شنیدن نام مبارک رسول اللہ صلعم و رہمہ جایگاہ ہمہ کس دو انگشت بر چشم می نہند، دریں باب حدیثے می آرند صحت آں

بجگونہ است، بندگی مخدوم عظمہ اللہ فرمود کہ آں حدیث جائے در کتب احادیث کہ معتبر و معروف دریں دیار است نمی یابم"

خوان پر نعمت مجلس بست و چہارم، "اگر مو، و لادی الصالحون للہ والطالحون لی" اس حدیث کے متعلق آپ فرماتے ہیں، کہ در کتب حدیث در نظر نیامدہ اما حدیث میگویند،

از مکتوبات مولانا امام مظفر بلخی قدس سرہٗ، مکتوب صد و سی و نہم بنام حضرت مخدوم، شنیدہ شد کہ مولانا زین الدین ساکن دیوہ بہ بندگی مخدوم صحیح مسلم و کتاب معتبر و معتمد در علم حدیث آوردہ است، و بہ نزدیک مخدوم کتب احادیث بسیار جمع شدہ است"

از مکتوبات صدی، در مکتوب نود و سوم در سماع، یکے از صحیح برائے دلیل اینجا یاد کنیم" اور دوسری جگہ فرماتے ہیں "ایں در صحیح بخاری است نہ در دفر مذکران است"

فتح المعانی مجلس بست و سوم میں آپ فرماتے ہیں، "اینک برمن چندیں کتابہا ست ہمہ را خواندہ ایم و میدانیم کہ دریں کتابہا چیست"

فتح المعانی مجلس بست و ہشتم میں آپ فرماتے ہیں کہ "در شرح مصابیح آوردہ است"

خوان پر نعمت مجلس چہل و سوم میں جامع صغیر سے آپ روایت کرتے ہیں،

ملفوظ الصفر، ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷۶۲ھ کی مجلس میں مشارق کی حدیث نقل کی ہے،

خوان پر نعمت مجلس پنجم، دریں وقت حدیث را اگر از مغیلاں بپرسند، در مانند علم احادیث مشکل علم است جملہ اقسام کتاب دراں موجود است، تاہمہ ندانند معنی یک حدیث نتوانند گفت،

گنج لایخفی، ۱۴ ذی القعدہ ۷۴۹ھ کی مجلس میں حدیث شریف سے متعلق ایک طولانی بحث آپ نے کی ہے، فرماتے ہیں کہ در نقل احادیث بہ معنی نہ بعین لفظ اختلاف علما است یعنی اگر کسی را کہ عین لفظ مبارک حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم یاد نماندہ است مضامین تمام در خاطر ماندہ اگر آں معنی را بعبارت خود روایت کنند روا باشد یا نہ علماء را دریں اختلاف است، بعضے میگویند درست نیست، زیرا کہ لفظ مبارک رسول علیہ السلام متحمل چندیں اقسام است چنانکہ دلالت و اشارت صریح و کنایت مفسر و مجمل، و متشابہ تا ہشتاد و چہار قسم در حدیث پیغامبر علیہ السلام موجود است الی آخرہ پھر اسی مجلس

میں راوی حدیث کے لئے عدالت و فقاہت، ضبط و صیانت، دیانت و حفظ کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، پھر اسی مجلس میں حدیث کی تقسیم آپ نے فرمائی ہے، کہ احادیث مرسل است و مسند ست و معروف ست و مجہول ست و غریب ست و مسند آوّل ست الی آخرہ،

غالباً ان اسناد سے اس کا پتہ ملتا ہے کہ حدیثوں پر آپ کی نظر بہت وسیع تھی، اور اس فن سے آپ پوری طرح واقف تھے،

یہ بھی عرض کر دینا ہے کہ حضرت مخدوم علم حاصل کرنے کے لئے دہلی تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ سنار گاؤں تشریف لے گئے تھے جو مضافات ڈھاکہ میں سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ایک صدر مقام تھا، وہیں حضرت مولانا شرف الدین ابو توامہ بخاریؒ سے آپ نے تمام و کمال علم دین حاصل کیا،

حضرت مخدوم شعیب قدس سرہٗ جو حضرت مخدوم کے چچا زاد بھائی اور خلیفہ و مرید ہیں اپنی تصنیف مناقب الاصفیا میں فرماتے ہیں:-

"مدتے در صحبت مولانا اشرف الدین ابو توامہ بخاریؒ در سنار گاؤں ماند، در تحصیل علوم دین با قصی الغایت کوشید تا آنکہ تحصیل علوم دین شد، و دراں وقت آوازۂ عظمت و بزرگی مولانا اشرف الدین ابو توامہ در ولایت ہند بلکہ در عرب و عجم برآمدہ بود، در جمیع علوم کمال داشت"

تحصیل علم کے بعد جس وقت آپ کی عمر شریف تقریباً ۳۰ سال کی تھی، پیر کی تلاش میں یعنی غالباً ۶۹۱ھ میں دہلی تشریف لے گئے، اس وقت حضرت سلطان الاولیاء قدس سرہٗ اسی عالم میں جلوہ افروز تھے، حضرت مخدوم نے ملاقات کی اور دل پسند باتیں کیں، بیعت طریقت کے بعد بہیا اور راجگیر کے جنگل میں تقریباً ۳۰ سال تک آپ مشغول حق رہے، بہار شریف بمقام خانقاہ معظم سجادۂ ارشاد پر حضرت مخدوم نے ۷۲۳ھ کے بعد جلوس فرمایا، جب آپ کے کمالات ظاہری و باطنی کی بہت زیادہ شہرت ہوئی تو اپنے آخر وقت میں محمد شاہ تغلق نے آپ کو راجگیر پرگنہ عطا فرمایا، آپ اس کے متحمل نہ ہو سکے اور موقع کی تلاش میں رہے، یہاں تک کہ بعہد فیروز شاہ تغلق اس کی واپسی کے لئے دوسری دفعہ ۷۵۳ھ کے بعد دہلی تشریف لے گئے ہیں،

اس وقت حضرت سلطان الاولیا قدس سرہ کا وصال ہوچکا تھا،

یہ بھی عرض کرنا ہے کہ برادرم فخرالدین سے مولنا فخرالدین زرادی کا قیاس صحیح نہیں، حضرت سلطان الاولیاء کے خلفا کا نام حضرت مخدوم اس بے تکلفی سے نہیں لیتے ہیں، اور نظامی جماعت سے آپ کو فیض حدیث نہیں پہونچا ہی، کیونکہ جو کچھ پڑھا ہے اپنے استاد مکرم سے آپ نے پڑھا ہی، یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید قدس سرہٗ حضرت مولنا امام مظفر بلخی قدس سرہ کے مرید نہیں ہیں، بلکہ حضرت مخدوم کے مرید ہیں، حضرت مولانا کے مسترشد ہیں، اور معدن المعانی حضرت مخدوم کا ایک بے مثل ملفوظ ہے، حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید کی تالیف سے نہیں ہے، وہ کوئی دوسری کتاب ہوگی جسمیں آپ نے شرح صحیح مسلم کے مطالعہ کا حال لکھا ہے، حضرت مخدوم کی تاریخ ولادت شرفت آگیں ۷۶۲ھ اور وصال پر شرفت ۸۶۲ھ،

حضرت مخدوم کے بعد آپ کے جانشین مولنا امام مظفر بلخی قدس سرہ ہوئے، جس وقت حضرت مولنا مرید ہوئے اسی وقت آپ ایک متبحر عالم تھے، چنانچہ مونس القلوب ملفوظ مولنا احمد لنگر دریا کی یہ عبارت ہے، "پیش ازانکہ شیخ مظفر مرحوم بر حضرت مخدوم جہاں بیایند در دہلی شہرۂ علم ایشاں شدہ بود، سلطان فیروز در کشک لعل مدرس گردانیدہ بود" بعدہٗ خوب مجاہدہ کیا، ریاضت کی، اور حضرت مخدوم کی صحبت میں رہے، حضرت مولانا کے مکاتیب میں بھی بکثرت صحیحین کی حدیثیں آتی ہیں، اور حضرت مخدوم آپ کو برابر امام لکھتے ہیں، مکتوبات بست و ہشت کے مکتوب دوازدہم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولنا امام مظفر بلخی نے مشارق کی شرح بھی لکھی تھی، ان کی رحلت ۸۰۳ھ میں ہوئی، حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید کو احادیث کی سند حضرت امام مظفر سے پہونچی ہی، جو حضرت مولنا کے برادر زادہ و مسترشد و جانشین تھے، چنانچہ از رسالہ مولنا مظفر بلخی مطبوعہ ۱۳۰۱ھ جو سند آپ نے حضرت حسین نوشہ توحید کو دی ہی، اس کا ایک فقرہ یہ ہی کہ فرزند حسین سند حدیث بریں فقیر کردہ صحیح مسلم و صحیح بخاری من اولہ و آخرہ، لفظا بریں فقیر تحقیق کردہ،"

حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید کی متعدد تصنیفات ہیں، ایک مختصر رسالہ اوراد و فصلی کے نام سے موسوم ہی جسمیں صحیح بخاری، صحیح مسلم و جامع ابو عیسیٰ ترمذی و سنن نسائی و سنن ابوداؤد و سنن ابن ماجہ و سنن بیہقی و ابن السنی و مستدرک

حاکم ابی عبداللہ کی روایتوں سے ملو ہی، آپ کی رحلت ۸۴۴ھ میں ہوئی، آپ کے بعد حضرت مخدوم و مولنا حسن دائم جشن یعنی آپ کے صاحبزادے سجادہ نشین ہوئے، یہ حضرت بھی علم کے مخزن تھے چنانچہ حضرات خمس کی شرح آپنے لکھی ہی، آپنے ۸۶۰ھ میں رحلت فرمائی کمالات ظاہری و باطنی سے حضرت مخدوم احمد لنگر دریا یعنی صاحبزادہ و جانشین کو اس قدر مالا مال فرمایا کہ وہ یکتائے روزگار ہوئے، مونس القلوب جو حضرت مخدوم احمد لنگر دریا کا ملفوظ ہی اس میں آپ صحیح بخاری و صحیح مسلم و مشارق و دیگر احادیث سے بکثرت حوالہ دیتے ہیں، اور حدیث لاتے ہیں، اسی ملفوظ میں آپ خود فرماتے ہیں کہ پڑھنے کے زمانہ میں حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید کی خوشنودی کے لئے میں نے چھ مہینے کی مدت میں متن مصابیح حفظ کرلی تھی، آپ کی رحلت ۸۹۱ھ میں ہوئی،

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مخدوم کے عہد سے بہار کی خانقاہ میں قال الرسول کا ترانہ سمع نواز ہوتا رہا جسے گوش شنوا سنتے آئے اگر معارف اس یاد کو تازہ کرنے کا متحمل ہو سکے، تو براہ نوازش آپ مضمون ہذا کو شایع فرماویں، میں مشکور ہونگا، اور آپ ماجور، والسلام،

الفاروق

یعنی حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت، صحابہؓ کے فتوحات طریقہ حکومت، عراق و شام مصر اور ایران کے فتح کے واقعات حضرت عمر کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر مولانا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہی، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گراں پایہ کتاب کے بیسوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت، اعلیٰ چھپائی عمدہ کاغذ، دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائیٹل، ضخامت ۱۲-۵ صفحے، قیمت للعہ

"منیجر"

تلخیص وتبصرہ

مریخ اور اس کی آبادی

غروبِ آفتاب کے بعد جو سرخ رنگ کا روشن تارا نظر آتا ہے یہ مریخ ہے جب سے اس میں زندہ مخلوق کا سراغ لگا ہے، اس وقت سے یہ علمائے ہیئت کا مرکزِ توجہ بنا ہوا ہے، کرۂ زمین اور کرۂ مریخ میں ۶۰ ملین میل کا فاصلہ ہے، ۱۹۲۴ء میں یہ کرۂ زمین سے ۳۴ ملین میل کے فاصلہ پر آگیا تھا، ۱۹۲۶ء میں پھر ۴۲ ملین میل کے فاصلہ پر ہٹ گیا، گذشتہ دسمبر میں یہ ۵۰ ملین کا فاصلہ ہوگیا، تاہم علمائے ہیئت اس قربت کو بھی غنیمت سمجھتے ہیں، تاکہ جس منطقہ سے بھی کم سے کم فاصلہ ہو وہاں محکم آلاتِ رصد کے ذریعہ اس کی زندہ مخلوق کا پیچیدہ مسئلہ حل کرلیں بعض علمائے ہیئت کے نزدیک مریخ کی آبادی اتنی ترقی یافتہ ہے کہ وہ علوم ہندسہ کی ماہر ہے،

حال میں ایک امریکن رسالہ نے ایک مقالہ لکھا ہے جسمیں اس موضوع پر تمام امریکن علمائے ہیئت کے آراء و مباحث جمع کردیے ہیں، اس مسئلہ پر تقریباً سب کے سب متفق ہیں کہ جدید انکشافات سے سطحِ مریخ میں زندہ مخلوق کے وجود کی تائید ہوتی ہے، البتہ اس کے مدارجِ ترقی میں اختلاف ہے، ڈاکٹر بکرنج کہتے ہیں کہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سطحِ مریخ پر زندہ اور ذی عقل مخلوق موجود ہے اور کرۂ ارض کے باشندوں سے سلام و پیام کرنا چاہتی ہے، لیکن ڈاکٹر ہیٹ کا خیال ہے کہ مریخ کی زندہ مخلوق نباتات تک محدود ہے، کیونکہ وہاں کے فضائی حالات نباتات کے علاوہ اور کسی زندہ مخلوق کی طبیعت کے موافق نہیں ہیں، لیکن پروفیسر ہل، الکن اور فشر کی رائیں گذشتہ دونوں بیانات کے بین بین ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ سطحِ مریخ پر مہذب انسانوں کی آبادی مستبعد تو نہیں ہے لیکن اس مسئلہ پر اب تک جس قدر علمی دلیلیں قائم ہوئی ہیں، اُن سے حیوانات

اور نباتات سے بلند کسی مخلوق کا ثبوت نہیں ملتا،

بہرحال ان مباحث سے اتنی بنیاد ضرور قائم ہوگئی کہ جو لوگ پروفیسر لول اور بکرنج کے مباحث کا مضحکہ اڑاتے تھے، اب وہ بھی سنجیدگی سے غور کررہے ہیں، جدید مباحث سے یہ مسئلہ پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ سطحِ مریخ پر حرارت، پانی اور آکسیجن بقائے حیات کے تینوں لوازم موجود ہیں، اور آلاتِ رصد اور فوٹوگرافی کے ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ مریخ کے لوازمِ حیات کرۂ زمین کے لوازمِ حیات سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں، ان مسائل میں سب سے اہم اور دقیق مسئلہ مریخ کے درجہ حرارت معلوم کرنے کا تھا، لیکن ڈاکٹر کوبلنٹز نے ایک نہایت نازک آلہ کے ذریعہ سے جو ترموکپل کے نام سے مشہور ہے، اس مسئلہ کو بھی حل کردیا، اس آلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوپہر کے قریب مریخ کا درجہ حرارت فارن ہیٹ ہے، لیکن یہ انکشاف سابق علمائے ہیئت کی رائے کے مخالف ہے، جن کا خیال تھا کہ مریخ میں درجہ حرارت صفر سے نہیں (بڑھتا)،

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کرۂ ارض سے مریخ کی اس قدر دوری کے باوجود اس کا درجہ حرارت کیونکر معلوم ہوگیا، حالانکہ اب تک جس قدر مقیاس الحرارت تھے وہ حرارت کی فضا سے علحدہ ہوکر حرارت کا اندازہ نہیں کرسکتے تھے، لیکن علمائے ہیئت نے ایسا سریع الاحساس آلہ بنالیا ہے جس کے ذریعہ سے محض محرور چیز کے عکس سے حرارت کا پتہ چل جاتا ہے، چنانچہ اس آلہ پر جب مریخ کی شعاعیں پڑتی ہیں تو اس سے روشنی پیدا ہوتی ہے اور اس آلہ کے ایک خاص حصہ کو گرم کردیتی ہے، گرمی پہونچتے ہی اس سے برقی لہریں پیدا ہوتی ہیں اُن لہروں سے درجۂ حرارت کا اندازہ ہوجاتا ہے،

ڈاکٹر کوبلنٹز اس سوال کے جواب میں کہ کیا مریخ میں عقلی حیثیت سے کوئی اعلیٰ ترقی یافتہ جماعت موجود ہے؟ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں، البتہ درجۂ حرارت ثابت شدہ ہے، پروفیسر لامپلانڈ، پروفیسر بٹی اور پروفیسر نکلسن کے مباحث سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ دوپہر کے قریب فضائے مریخ کا درجہ حرارت بلید کے درجہ سے نہیں بڑھتا، بہرحال مختلف اوقات کی حرارت کے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰ سے لیکر ساٹھ تک گھٹتا بڑھتا رہتا ہے،

کرۂ ارضی کی مخلوقات کے اندازہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرارت زندگی کے مناسب ہے، پھر بھی یہ

سوال باقی رہجاتا ہے کہ کیا کرۂ مریخ آباد ہے، اور یہ آبادی متمدن اور ترقی یافتہ ہے؟ ڈاکٹر کو بلنٹز، رسل، فشر اور انگیسن وغیرہ علمائے ہیئت اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں کیونکہ مریخ کی فضا کے نیچے اوپر اور دن و رات کی حرارت میں اتنا اختلاف ہے جس میں زندگی دشوار ہے،

اگر دوربین کے ذریعہ سے سطحِ مریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس میں نقطے اور خطوط نظر آتے ہیں، سر ولیم ہرشل کے زمانہ سے یہ علم ہو چکا ہے کہ جاڑا آتے ہی مریخ کے دونوں قطبوں پر بڑے بڑے سپید بقعے بنجاتے ہیں اور گرمی میں بتدریج تنگ ہوتے جاتے ہیں، مریخ میں پانی بھی نظر آتا ہے، جو جاڑے میں قطبین کے پاس جم کر برف اور اُدلا بنجاتا ہے، اور گرمیوں میں پھر پانی بنجاتا ہے، سطحِ مریخ پر جو خطوط نظر آتے ہیں، ان کے متعلق پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا، کہ یہ سیرابی کے لئے نہریں بنائی گئی تھیں، لول نے اسی سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ یہاں کے باشندے عقلی حیثیت سے بلند اور علوم ہندسہ سے واقف ہیں لیکن پروفیسر انطونیاڈی اور کوہ ولسن کی رصد گاہ کے دوسرے علمائے ہیئت کے جدید مباحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان خطوط سے سطحِ مریخ پر سبزی کا پتہ چلتا ہے، کیونکہ فصل ربیع میں ان خطوط کا رنگ سبز ہوتا ہے، اور پھر رفتہ رفتہ بدل کر خریف میں تانبے کا ہو جاتا ہے،

اصولِ عمران کی رو سے نباتات کے وجود کے ساتھ حیوانات بھی ہوتے ہیں اس لئے ڈاکٹر انگیسن، شیپلی، رسل، کوبلنٹز، اڈمز، فرسٹ، سلیفر اور بگر نج کا خیال ہے کہ مریخ میں بھی آبادی موجود ہے، ڈاکٹر اڈمز کہتے ہیں کہ پروفیسر رسل کے مباحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مریخ کی فضا میں پانی کے بخارات بدلیوں اور قطبین کے پاس جاڑے گرمی میں برف کے گھٹنے بڑھنے سے پانی کے وجود کی تائید ہوتی ہے، مریخ کی فضا میں جتنی حرارت کا قیاس کیجاتی تھی اس سے زیادہ ہے، ان تمام عناصر کے ہوتے ہوئے مریخ کی سطح پر زندہ مخلوق کے وجود کا کوئی مانع نہیں نظر آتا،

غرض جدید مباحث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مریخ کی زندہ مخلوق ہماری دنیا کی طرح نباتات اور حیوانات پر مشتمل ہے، اس سے ہم علمی دنیا اور تخیل میں حدِ فاصل قائم کر سکتے ہیں، اور پروفیسر لول کے اس دعویٰ سے کہ مریخ میں زندہ مخلوق موجود ہے اور عقلی حیثیت سے وہ بہت ترقی یافتہ اور علوم اور صناعات میں ماہر ہے، نہ قطعی انکار کر سکتے ہیں اور نہ پوری تائید کر سکتے ہیں، موجودہ آلاتِ رصد سے ہم کسی علمی طریقہ سے اس معمہ کو حل نہیں کر سکتے، ہمکو آخری فیصلہ کے لئے آلاتِ رصد کی ترقی اور علمائے ہیئت کی مزید تعیین و تحقیقات کا انتظار کرنا چاہیئے، "م"

انگریزی کا ضخیم و مُستند ترین لغت

جامعہ آکسفورڈ کا عظیم الشان کارنامہ

یوں تو انگریزی زبان میں معمولی چھوٹے لغتوں سے لے کر انسائیکلوپیڈیا تک موجود ہیں، لیکن جامعہ آکسفورڈ نے اپنی ہفدہ سالہ مسلسل کوششوں سے جو ضخیم اور ہمہ گیر مستند لغت مرتب کیا ہے، وہ لغاتی دنیا میں بے مثل ہے، تقریباً تمام علمی رسائل نے اس پر شاندار تنقیدیں شائع کی ہیں، ابتدا میں یہ لغت ۱۸۹۶ء میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ آنجہانی کے نام معنون کیا گیا تھا، لیکن تکمیل کے بعد اس کا انتساب موجودہ حکمراں ملک معظم جارج پنجم کے نام کیا گیا ہے، اس کی اہمیت، وسعت اور ہمہ گیری سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہم ذیل میں ایک ادبی رسالہ کی تنقید کی تلخیص پیش کرتے ہیں:-

"تمام دوسرے لغتوں کے مقابلہ میں، آکسفورڈ لغت کی صحت و کمال کا ہر شخص معترف ہے، یہ بلند ترین اور بے مثل لغت ہے، اس کے بے مثل ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف ہمارے عہد کی انگریزی کا لغت نہیں ہے، بلکہ ہر عہد کی انگریزی کا، خواہ وہ چاسر کی انگریزی ہو یا بائبل کی، شکسپیر کی ہو یا کسی عہد موجودہ کے ادیب کی، جب ہم اس کو اس حیثیت سے دیکھتے ہیں تو یہ واقعہ کہ اس کا پہلا حصہ ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا تھا نسبتۃً غیر اہم معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبان کے لیے ۴۴ سال کا زمانہ ایک مختصر ترین عہد ہے، اس کے ساتھ ہی اس اثنا میں جو جدید چیزیں عالم وجود میں آئی ہیں، ان کے لیے ایک اور حصہ بطور ضمیمہ زیر ترتیب ہے، اس لغت کی کامیابی کا سہرا ایک بڑی حد تک جامعہ کی مجلسِ لسانیات کے سر ہے، اس کی ترتیب، تدوین اور طباعت کے تمام فرائض جامعہ ہی نے ادا کئے ہیں، اور اس پر ۳۰۰۰۰ پونڈ صرف ہوئے ہیں، البتہ

چھٹی جلد کے لیے ورشپ فل کمپنی Worshipful Company نے پانچ ہزار پونڈ دیئے تھے، اور ۶ جون ۱۹۲۸ء کو اس کمپنی نے اس کارنامہ کی تکمیل کو خاص طور سے منایا،

ستر سال کے بعد جامعہ یہ اعلان کرنے کے قابل ہوا ہے کہ اس کا لغت A سے Z تک مکمل ہو گیا، ۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو مجلسِ السنہ نے ایک مکمل لغت کی تدوین کا بیڑہ اٹھایا تھا، اس کا محرک ڈین ٹرنچ (Dean Trench) تھا، ابتدا ہی سے اس کی وسعت و ہمہ گیری کا احساس تھا، ابتداءً یہ کام دو جماعتوں کے سپرد کیا گیا تھا اور کالرج، اور فرنیوال کو اسکی طباعت کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے مقرر کیا گیا، ۱۸۵۹ء میں کالرج کو اڈیٹر مقرر کیا گیا کہ وہ ان ماخذوں کو جن سے یہ لغت مرتب ہوگا، جمع کرے، اپریل ۱۸۶۱ء میں کالرج کا انتقال ہو گیا، اور فرنیوال کو یہ کام جاری رکھنا پڑا، اس کے بعد اگرچہ فرنیوال اپنے کام میں مشغول رہا لیکن بظاہر مجلسِ السنہ نے اس سے دلچسپی لینا چھوڑ دیا کہ ۲۴ اپریل ۱۸۶۲ء سے ۶ نومبر ۱۸۶۸ء تک اس کی روداد میں اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ملتا، اس کے بعد ۱۸۶۸ء کے سالانہ خطبۂ صدارت میں اس کا پھر ذکر آیا، پھر ۱۸۷۶ء میں ڈاکٹر جے، اے، ایچ مرے، نے جمع شدہ مواد پر کام کرنا شروع کیا، اور اسی کی کوششیں اس تخیل کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ دار ہیں، ۱۸۷۸ء میں کلیرنڈن پریس سے اس کی طباعت کے متعلق گفتگو طے پائی، اس وقت لغت کی ضخامت کا اندازہ موجودہ لغت کا نصف تھا، مئی ۱۸۸۲ء میں ڈاکٹر مرے نے اعلان کیا کہ متعدد اصحاب علم کی مدد سے انھوں نے تدوینِ لغت کا کام حقیقی معنوں میں شروع کر دیا ہے چنانچہ یکم فروری ۱۸۸۴ء کو اس کا پہلا حصہ شائع ہو گیا، اور اس وقت سے برابر اس کے حصے شائع ہوتے رہے تا آنکہ ۴۴ سال بعد یہ لغت موجودہ مکمل شکل میں ہمارے سامنے ہے،

لغت کی تدوین میں چھ آدمیوں نے چیف اڈیٹر کے خدمات انجام دیئے ہیں، ان میں سے اول الذکر دو کو تو صرف مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے سمجھنا چاہئے،

(۱) ہربرٹ کالرج (۱۸۳۰–۱۸۶۱ء)

۲- فریڈرک جیمس فرنیوال (۱۸۲۵–۱۹۱۰ء)

۳- جیمس آگسٹس ہنری مری (۱۸۳۷–۱۹۱۵ء) اس کے ماتحت تقریباً نصف لغت شائع ہوا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:- A سے D، H سے K، O، P اور T، اس کے علاوہ لسانیات وغیرہ پر متعدد کتابوں کا بھی مصنف تھا،

۴- ہنری بریڈلے (۱۸۴۵–۱۹۲۳ء) بریڈلے کا اس لغت سے تعلق عجیب طریقہ سے پیدا ہوا، ۱۸۸۴ء میں جب اس کا پہلا حصہ شائع ہوا تو اس نے اس پر تنقید لکھی، اور اس تنقید نے ظاہر کر دیا کہ اسے لسانیات سے کس قدر واقفیت ہے، اس نے حروف E، F، G، L، M، S–Sh، St اور W–We کے الفاظ مرتب کیے،

۵- ولیم الگزنڈر کریگی (۱۸۶۷ء) سے ۱۸۹۷ء میں لغت کی تدوین میں امداد کے لیے مدعو کیا گیا، اور اسی سال جولائی سے اس نے عملی شرکت شروع کر دی، اس نے مستقل طور سے ۱۹۰۱ء سے کام شروع کیا اور Q کے علاوہ U، V، Si–Sq، R، N اور Wo–Wy کے کچھ حصہ کے الفاظ مرتب کیے،

۶- چارلس ٹلبوٹ اونینس (۱۸۷۳ء) اس نے ڈاکٹر مرے کی دعوت پر ۱۸۹۵ء میں ادارت میں شرکت کی، ڈاکٹر مرے اور ڈاکٹر برڈلے کے ساتھ کام کرنے کے بعد مستقل حیثیت سے اس نے Su–Sz، Wh سے Worling تک کے الفاظ مرتب کئے،

(ہر)

(دن،)

تصحیح

گذشتہ ماہ میں رسالہ مبصر کی تنقید کے سلسلہ میں دو غلطیاں رہ گئی ہیں، ناظرین ان کی تصحیح فرمالیں،

(۱) رسالہ جس جماعت کی طرف سے شائع ہوتا ہے وہ اخوان الصفا کی مجلس نہیں بلکہ معراج الادب کی ہے،

(۲) معاون صاحب کا تخلص شیفتہ نہیں آشفتہ ہے،

"ض"

اخبار علمیہ

امریکہ میں سگرٹ کا خرچ

اب سے چند سال پہلے تک امریکہ میں صرف ایک بڑی کمپنی تھی جو سگرٹ کی تجارت پر قابض تھی لیکن حکومت کے حکم سے اب وہ چار جماعتوں میں منقسم ہوگئی ہے، اور یہ چارٌن گروہ تجارتی مقابلہ اور جنگ میں مصروف اور ہر کمپنی اس اسراف کی ترویج میں ہمہ تن مشغول ہے، ۱۹۲۷ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں جو سگرٹ خرچ ہوئے ان کی تعداد .... ۹۷ تھی اور ۱۹۲۸ء میں یہی تعداد .... ۱۰۶ تک پہنچ گئی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہاں کی آبادی کے ہر رکن نے خواہ عورت ہو یا مرد جوان ہو یا بچہ سال میں ۹۰۰ سگرٹ پئے، یہ چار کمپنیاں اس تجارت میں جو رقم لگا رہی ہیں وہ یہ ہے:-

(۱) امریکن ٹوبیکو کمپنی ...... ۴۰۰۰۰۰ پونڈ (۳) آر، جے، رینالڈس ...... ۳۱۵۰۰۰۰ پونڈ

(۲) لیگٹ اینڈ میرس ...... ۳۸۰۰۰۰۰ " (۴) پی، لوری لارڈ ...... ۲۰۵۰۰۰۰ "

اول الذکر کمپنی نے اس سال اشتہارات کے لیے جو رقم منظور کی ہے، وہ ۲۶۰۰۰۰۰ پونڈ ہے،

"ب"

دنیا کی بڑی دوربین

ناظرین معارف کو یاد ہوگا، کہ آج سے چند سال پہلے اطالوی حکومت نے جرمنی سے تاوان جنگ کے سلسلہ میں نقد کی جگہ کتابیں لی تھیں، اور اب اس نے اسی سلسلہ میں ایک بہت بڑی دوربین کا

مطالبہ کیا ہے، یہ دوربین اطالیہ کی سب سے بڑی دوربین ہوگی، اس کا قطر ½ ۲۵ انچ ہوگا، حال ہی میں دو سری بڑی دوربین ستاروں کی دریافت کے لیے نصب کی گئی ہیں، ان میں دو جنوبی افریقہ میں ہیں، ان میں سے ایک جس کا قطر ۲۷ انچ ہے بلوم فاونٹین میں ہے اور دوسری ½ ۲۶ قطر کی جانس برگ میں، اس وقت دنیا کی سب سے بڑی دوربین جامعہ چکاگو کے رصدخانہ یارکس میں ہے اور اس کا قطر ۴۰ انچ ہے،

(ب)

بعض جدید مطبوعات

گذشتہ تین مہینوں میں اسلام و اسلامیات سے متعلق جو کتابیں مختلف زبانوں میں شائع ہوئی ہیں، ان میں مندرجہ ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں:-

نام مصنف	نام کتاب
(۱) جے، ایر سالٹ	مشرق و مغرب (مشرق کا اثر فرانس پر)
(۲) گریس ایلسن	جدید ترکی،
(۳) خالدہ ادیب خانم	ترکی کا یوم ابتلاء،
(۴) پالمر (مقدمہ اذ، ڈبلیو، نکلسن)	ترجمۂ قرآن مجید
(۵) ایچ، جے، پی فلبی	وہابیوں کا عرب
(۶) ریلڈن وٹر	عرب کے مقدس شہر (دو جلد)
(۷) ایم سمتھ	حضرت رابعہ بصری اور دوسری صوفیہ خواتین
(۸) احمد امین	فجر الاسلام (جلد اول) یہ کتاب ابتدائے عہدِ اسلام کی ذہنی ترقی پر ہے، اس کی تین جلدیں ہونگی، باقی دو جلدیں طہٰ حسین اور عبد الحمید العبادی لکھیں گے،

نام مصنف	نام کتاب
(۹) الرافعی	شرح الہاشمیات لشاعر الشہیر الکمیت (دوسرا ایڈیشن)
(۱۰) آر البیث	دیوان عروہ بن الورد
(۱۱) ابن الجزری	النشر فی قرأت العشر (دو جلد) اس میں سات مروجہ طریق قرأت کے علاوہ حضرت ابو جعفر یعقوب اور خلف کے طریقے بھی دیے ہوئے ہیں،
(۱۲) جاحظ	البیان والتبیین ۳ جلد
(۱۳) زدیمر	دنیائے اسلام
(۱۴) براؤن	تاریخ ادبیاتِ ایران ۴ جلد، جامعہ کیمبرج نے اسکی پہلی دو جلدوں کو بھی اپنے یہاں دوبارہ شائع کیا ہے،
(۱۵) پروفیسر ہادی حسین	ایرانی بحری قوت کی تاریخ،
(۱۶) ہبرٹ	سفرنامۂ ایران

ایک نظریہ کی غلطی،

ہندوستان میں بعض جگہ یہ دستور تھا اور شاید اب بھی کہیں ہو کہ مجرموں سے اقبالِ جرم حاصل کرنے کے لیے ان کو منشی چیزیں دی جاتی تھیں اور وہ ان کے اثرات کے ماتحت سچی باتیں بتاتے تھے، اب سے چند سال قبل ڈاکٹر آر، ای، ہاؤس نے بھی اس طریقۂ کار کی صحت پر علمی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے اسے صحیح بتایا تھا، اور بعض جگہ لوگوں نے اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا، لیکن حال میں چند ایسے واقعات پیش آئے ہیں، جنھوں نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے، چنانچہ ایک قتل کے سلسلہ میں جب ایک شخص پکڑا گیا، تو اس نے اس سے انکار کیا، لیکن نشہ کے اثر میں اس نے اقبال کیا، لیکن نشہ اترنے کے بعد پھر انکار کرنے لگا، اور اس کے ساتھ ہی اصل قاتل کا پتہ لگ گیا اور وہ شخص بے قصور ثابت ہوا ہے، اسی قسم کے چند اور واقعات کی بنا پر اب ثابت ہو گیا ہے کہ یہ نظریہ بالکل غلط تھا،

(س)

جاپان اور علمی ترقی،

علم طب کی ترقی میں جاپانیوں کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے، یہ امتیاز صرف اس لیے نہیں ہے کہ ہیدیو نوگوچی نے زرد بخار کی تحقیقات میں جان دیدی، بلکہ اس کے علاوہ بہت سے جاپانی علماء نے عضویات اور علم الجراثیم کے متعلق کارآمد و مفید اور اصولی باتیں دریافت کی ہیں، وہاں کی حکومت بھی ان کی ہمت افزائی کو اپنا فرض سمجھتی ہے اور اسی خیال سے حال میں، اس نے ایک تمغۂ اعزاز علم و تمدن کے متعلق مقرر کیا ہے، اس کا جاپانی نام بنکو کنشو ہے، یہ تمغہ بلند ترین ادبی و علمی خدمت کے عوض دیا جاتا ہے،

اس وقت تک یہ تمغہ صرف دو صاحبوں کو ملا ہے، ان میں سے ایک ڈاکٹر شیدگا ہے، جس نے ڈاکٹر فلکسنر کے ساتھ ضعفِ معدہ کے متعدی جراثیم دریافت کئے ہیں، اور دوسرا ڈاکٹر ناوا ہے،

(س)

کاغذ کی بوتلیں،

اس وقت تک یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ دودھ میں جراثیم پھیلانے کی سب سے زیادہ صلاحیت موجود ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ شیشہ کی بوتلیں جنمیں دودھ تقسیم ہوتا ہے مشکل سے بالکل اچھی طرح صاف کیجا سکتی ہیں، اسی خیال سے امریکہ کے ماہرین جراثیم نے عرصہ کے غور و خوض کے بعد اب یہ طے کیا ہے کہ دودھ کیلئے کاغذ کی بوتلیں استعمال کیجائیں، اور اس کاغذ کے بنانے میں ایسے اجزا استعمال کئے جائیں جو جراثیم کش ہوں، اب اس قسم کی بوتلوں کی ایک بڑی تعداد طیار ہو رہی ہے،

(س)

ادبیات

تابشِ سہیل

(از جناب اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)

صبحِ ازل سے دل پہ نظر آسماں کی ہے — یہ گرد کس کے جلوۂ دامن فشاں کی ہے

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے — بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

کونین ایک گوشہ ہے اس کی بساط کا — یارب حریمِ دل میں یہ وسعت کہاں کی ہے

صیاد اب قفس سے ڈراتا ہے کیا مجھے — تیرے کرم سے شکل وہی آشیاں کی ہے

دل کھول کر تڑپنے کا ساماں کیا کریں — کتنی بساط وسعتِ کون و مکاں کی ہے

اتنے پہ روز اٹھتی ہیں رہ رہ کے آندھیاں — اک مشت خاک برق زدہ آشیاں کی ہے

مٹ کر بھی آب و گل سے نہ رکھا معاملہ — یارب دلِ غریب کی مٹی کہاں کی ہے

صیاد فردہ باد عنادل میں چل گئی — اب کشمکش میں فکر کسے آشیاں کی ہے

جاتے رہے نمائشِ داغِ جنوں کے دن — اب مشہدِ وفا میں طلب نقدِ جاں کی ہے

واقف ہوں تیری زمزمہ سنجی سے ہم صفیر — بولی یہ سب سکھائی ہوئی باغباں کی ہے

ہوں اب تو ان کی چشمِ کرم سے بھی بے نیاز — اللہ کیا بہشت غمِ جاوداں کی ہے

کب تک شہیدِ شیوۂ رندانہ اے سہیل
تیری نوا تو بزم گہِ قدسیاں کی ہے

باب التقریظ والانتقاد

فیہ ما فیہ

یعنی

ملفوظات مولانا جلال الدین رومیؒ

مرتبہ

مولانا عبدالماجد بی۔ اے۔

اس وقت ہندوستان میں تصنیف و تالیف کا جو سلسلہ جاری ہے، عام طور پر اس کا مقصد صرف تصنیف و تالیف ہے، ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے کچھ اور مقاصد بھی حاصل ہو جائیں، لیکن یہ ایک ضمنی چیز ہے، خود مصنفین کا منتہائے نظر ملک کے سامنے ایک کتاب کے پیش کر دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں، لیکن ہماری خوش قسمتی سے اب بعض بلند خیال مصنف ایسے پیدا ہو رہے ہیں، جنکے نزدیک اصلی چیز، اصلاحِ خیال، اصلاحِ معاشرت، اصلاحِ مذہب، تہذیبِ اخلاق اور تزکیۂ نفس ہے، اور اگر یہ مقصد تصنیف و تالیف سے حاصل ہو سکتا ہے تو وہ بجائے خود کوئی اہم مقصد نہیں بلکہ ان مقاصد عالیہ کی تکمیل کا ایک ذریعہ و واسطہ ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ خود تصنیف و تالیف کو ایک ضمنی چیز سمجھتے ہیں اور نہ ان کا اصلی مطمح نظر چند سفید صفحات کے سیاہ کر دینے کے بجائے چند سیہ کاروں کے دلوں کو جلا دینا اور روشن کرنا ہے

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست — ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجاست

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اسی قسم کے بلند خیال مصنفین مین ہین جنھون نے مروجہ تصوف کی تہذیب و اصلاح کو اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد قرار دیا ہے، اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ قلمی جد وجہد کرتے رہتے ہین، چنانچہ اس سلسلے مین وہ اس سے پہلے ایک عمدہ کتاب تصوفِ اسلام کے نام سے شائع کر چکے ہین، اور زیرِ تبصرہ رسالہ اس زرین سلسلے کی دوسری کڑی ہے،

یہ رسالہ مولانا روم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو آج تک بالکل کمیاب بلکہ نایاب تھا، حسنِ اتفاق یا خوبیِ تقدیر سے ریاست رامپور کے کتبخانے مین مولانا عبد الماجد صاحب کی نگاہ سے اس کا ایک کرم خوردہ نسخہ گزرا، اور یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ درحقیقت یہ وہی مجموعہ ہے، جو آج تک ناپید اور فیہ ما فیہ کے نام سے مشہور تھا، اُن کی تفحص و تجسس کا سلسلہ شروع ہوا، تو ریاست حیدر آباد دکن مین اس کے دو نسخے اور دستیاب ہوئے، ان تین نسخون کی نقل کے حاصل ہو جانے کے بعد ان کے دل مین اس کی اشاعت یا موجودہ اصطلاح مین اس کے اڈٹ کرنے کا خیال پیدا ہوا، اسی اثنا مین ان سے اور کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن سے جو مولانا روم کے خاص شیدائیون مین ہین، اس رسالہ کے متعلق خط وکتابت شروع ہوئی اور انھون نے اپنے قسطنطنیہ کے ذی علم دوستون کے ذریعہ سے اس رسالہ کا وہان بھی کھوج لگانا شروع کر دیا، خوش قسمتی سے وہان اس کے چار نسخے دستیاب ہوئے، جن کے مقابلے سے اس نسخہ کی ایک اور نہایت خوشخط اور صحیح نقل تیار ہو گئی، جو صحت کے ساتھ ہندوستان کے تینون نسخون سے زیادہ جامع اور مکمل بھی تھی، بہرحال مولانا عبد الماجد کی تفحص و تلاش کا سلسلہ ۱۳۲۲ھ سے شروع ہوا، اور آج آٹھ برس کی سعی و تلاش کا یہ نتیجہ ایک مہذب صورت مین ہمارے سامنے آیا ہی،

اصل رسالہ ۲۲۴ صفحات مین ختم ہوا ہے اور اس کی اشاعت سے ہم پر مولانا عبد الماجد نے یہی احسان نہین کیا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا جو فضل ان پر کتبخانہ رامپور مین ہوا تھا اس مین ہم سب کو شامل کر لیا ہے بلکہ اس رسالے سے الگ انھون نے اس کی ابتدا مین سات صفحے کا ایک دیباچہ لکھا ہے، جسمین اس رسالے کے مختلف نسخون کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے، اور ان لوگون کے نام بتائے ہین جن سے ان کو اس اہم کام مین مدد ملی ہے، اس کے بعد ۴۲ صفحون مین

مولانائے روم کے حالات لکھے ہین، پھر گیارہ صفحات مین خود اس رسالے پر مفصل تبصرہ کیا ہے، اور اس تبصرے کا خلاصہ (یا اس رسالے سے ان کی اشاعت کا مقصد) ان کے الفاظ مین یہ ہے:-

"مولانا کا تصوف اسلام کا تصوف تھا، کتاب و سنت کا تصوف تھا، طاعت و عبادت کا تصوف تھا، تقویٰ و طہارت کا تصوف تھا، رندی و بے قیدی، آزادی و وارستگی کا تصوف نہ تھا، مولانا کی مجالس ذکر الٰہی و تزکیۂ نفس کی مجالس ہوتی تھین فیہ ما فیہ شروع سے آخر تک اسی تعلیم سے لبریز ہے، کہین کسی آیت قرآنی کی تفسیر بیان ہو رہی ہے، کہین کسی حدیث نبوی کی شرح ہو رہی ہے، کہین ملحدون اور بد مذہبون کی تردید ہو رہی ہے، کہین نماز کے لطائف و اسرار بیان ہو رہے ہین، کہین اصول و عقائدِ اسلام کی خوبیان روشن کیجا رہی ہین، کہین اصلاحِ نفس و تزکیۂ باطن کے طریقون کی تعلیم ہو رہی ہے، کہین اگلے بزرگون اور اللہ کے دوستون کے مناقب و فضائل ذکر ہو رہے ہین، بس ان کے علاوہ شروع سے آخر تک کسی مقام پر نہ آج کل کی رسمی پیرزادگی و سجادہ نشینی کا ذکر ہے، نہ قبور کے سجدہ و طواف کا نہ چادر اور گاگر کا اور نہ مروجہ عرس اور غسلِ مزارات کا"،

اس تبصرے سے اگرچہ اس رسالے کی بہت سی خوبیان نمایان ہو جاتی ہین، لیکن اردو خوان گروہ کے لئے اس سے زیادہ تشریح و توضیح کی ضرورت تھی، بہتر تو یہ تھا کہ اس رسالے مین جس قدر مضامین مذکور ہین سب کے الگ الگ عنوانات قائم کئے جاتے، اور ہر عنوان کے تحت مین بتا دیا جاتا کہ یہ مضامین فلان فلان صفحات مین درج ہین، اور اگر ممکن ہوتا تو ان کا خلاصہ بھی لکھ دیا جاتا، جیسا کہ انھون نے گمراہ فرقون کی تردید کے متعلق متعدد صفحات کے حوالے دیدیئے ہین،

کتاب مین جو آیتین اور حدیثین آئی ہین، مولانا عبد الماجد نے حاشیے مین ان کے ترجمے کر دیئے ہین اور مزید کرم یہ کیا ہے کہ حدیثون کی تخریج اور ضعف و صحت کی طرف بھی اشارات کئے ہین، لیکن عربی کی جو طویل عبارتین کتاب مین مذکور ہین معلوم نہین ان کی توجہ سے کیون محروم رہین؟ حالانکہ اردو خوان بلکہ فارسی خوان گروہ کے لئے اس کی اشد ضرورت تھی.

ان جزئیات سے قطع نظر کرکے اصل رسالے پر نگاہ ڈالی جائے تو جیسا کہ مولانا عبد الماجد صاحب نے لکھا ہے کہ:-

"اور ہر حیثیت سے فیہ مافیہ اور مثنوی دونون ایک ہی پھول کی پنکھڑیان، ایک ہی گلشن کی بہارین، ایک ہی نور کی تجلیان ہین"

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نثر مین مثنوی کا خلاصہ ہے، اس لیے اگر کسی کو مثنوی کے خلاصے کی ضرورت محسوس ہوتی ہو تو وہ اس رسالے سے اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے، البتہ اس اختصار کی وجہ سے اس مین مثنوی کی سی تکرار و تفصیل نہین پائی جاتی، اور جو کیف و مستی اور سوز و گداز مثنوی کے اشعار مین ہے، وہ اسکی سیدھی سادی عبارت مین پایا نہین جاتا، اس کے علاوہ مثنوی کی اور تمام خصوصیات اس مین موجود ہین، مثلاً مثنوی مین عموماً تمام مطالب کو تمثیلات و حکایات کے ذریعہ سے سمجھایا گیا ہے، اور اس رسالے مین بھی حکایات و تمثیلات سے ہر جگہ مطالب ذہن نشین کئے گئے ہین، اس لیے جو لوگ صرف معانی و مطالب کی توضیح چاہتے ہین، ان کے لئے یہ رسالہ مثنوی سے زیادہ مفید ہے، مثنوی کا جوش و خروش اور سوز و گداز عوام تو عوام خواص کو بھی اس کے اصل مطالب کی طرف متوجہ نہین ہونے دیتا، اس سے خود رفتگی اور سراسیمگی تو ضرور پیدا ہو جاتی ہے، لیکن یہی خود رفتگی اصل مطالب پر پردہ ڈال دیتی ہے، لیکن اس رسالے کے پڑھنے سے وہی مطالب نہایت سادہ طور پر ذہن نشین ہو جاتے ہین، اور کوئی چیز ان کی وضاحت مین مخل نہین ہوتی، بہر حال مثنوی کی توضیح و تشریح کا جو غیر مختتم سلسلہ اب تک جاری ہے، یہ رسالہ بھی اسی کی ایک زرین کڑی ہے، اور اس حیثیت سے نہایت قابل قدر ہے، کہ خود مولانا روم ہی نے اپنی زبان سے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

تصنیف را مصنف نیکو کند بیان،

یہ رسالہ ہمارے مطبع معارف مین نہایت عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ چھپا ہے، اور یہین سے مل سکتا ہے، عہ قیمت ہے،

"ع"

ذکریٰ

مصنفہ

مولانا خواجہ محمد عبد الحیٔ فاروقی

جناب مولانا خواجہ عبد الحیٔ صاحب فاروقی کی تفسیر قرآن کے متعدد حصے شائع ہو چکے ہیں اور اب اسکا ایک نیا حصہ ۲۷۲ صفحات کی ضخامت مین ذکریٰ کے نام سے بسلسلۂ اشاعت اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے شائع ہوا ہے، عہ قیمت ہے، اور جہان تک کتاب کی ظاہری صورت، کاغذ کی دبازت و صفائی، حسن کتابت و تحریر و ضخامت کا تعلق ہے، یہ قیمت کچھ زیادہ نہین ہے، خواجہ صاحب نے اس حصے مین قرآن مجید کے آخری سیپارہ عمّ کی تفسیر لکھی ہے، انداز تفسیر یہ ہے کہ ہر سورہ کی تفسیر سے پہلے اجمال و اختصار کے ساتھ اس کا حاصل مطلب یا موضوع یا خلاصہ لکھتے ہین، پھر مختلف عنوانات کے تحت مین سورتون کے مختلف ٹکڑون کی تفسیر کرتے ہین، زبان بالکل الہلال کی ہے، اور سیاسی خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا زور اگرچہ اس حصے مین کم ہو گیا ہے، تاہم اس کی جھلک کہین کہین موجود ہے، مثلاً:-

"زمین کا سنگار لٹ جائیگا، ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھیگی، اور اکثر فرزندان آدم مجسمۂ ملعونیت و شیطنت بن جائین گے"

"عیسائی اقوام کی حالت تمھارے سامنے ہے، جو انسانون کی صورت مین درندون اور بھیڑیون کی طرح اپنے ہی بھائیون کو چیرتے اور پھاڑتے ہین وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۸: ۱۰۴) اور وہ اپنی غلط فہمی سے اس خیال مین ہین کہ وہ اچھے کام کر رہے ہین یہ کفارہ کے نتائج ہین اور حریت فاسقہ کے ثمرات"

دوسرے موقع پر فرماتے ہین:-

"جو مسیحی اقوام اسلامی حکومتون کو برباد کرنے کی فکر مین ہین وہ اس شیطنت سے باز آجائین، ورنہ

اللہ کے آہنی پنجہ کی پکڑ بڑی سخت ہے،،

اس وقت اردو زبان مین ایک مبسوط و مکمل تفسیر کی سخت ضرورت ہے، لیکن یہ ضرورت صرف اس وقت پوری ہو سکتی ہے، جب تفسیر کا مقصد خود تفسیر ہو، کوئی دوسرا مقصد اس کا محرک نہ ہو، لیکن یہ ہماری بدبختی ہے کہ یہ مبارک فن ابتدا ہی سے مختلف فرقون اور مختلف اشخاص کے خیالات و عقائد کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بن گیا، اور آج تک اسی قسم کا ذریعہ بنا ہوا ہے، عربی مین متکلمین، ادبا، نحاۃ، وغیرہ نے جو تفسیرین لکھی ہین، ان مین ان کے مذاق و خیالات کا پرتو صاف نمایان ہے، اور اردو مین سر سید احمد خان کی تفسیر بھی ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے، اور خواجہ صاحب کی تفسیر بھی خاص خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ ہے، اس بنا پر ہم جس آب حیات کے پیاسے ہیں خواجہ صاحب کی تفسیر کو اس کا کوئی نمایان قطرہ نہیں سمجھ سکتے، تاہم وہ ہے تفسیر ہی، اور اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ:-

(۱) خواجہ صاحب کسی کے مقلد و متبع نہیں ہین، اس لیے جا بجا اجتہاد سے کام لیتے ہین، اور مفسرین سے اختلاف کرتے ہین، چنانچہ عم یتساءلون مین کلا سیعلمون ثم کلا سیعلمون کی تفسیر مین اکثر مفسرین سے اختلاف کیا ہے، اور ایک قابل قبول بات لکھی ہے، لیکن کہین کہین اس اجتہاد مین غلط روش بھی اختیار کر لیتے ہین، مثلاً سورۂ غاشیہ مین خداوند تعالیٰ نے انسانون کو جزاے اعمال کے لحاظ سے دو حصون مین تقسیم کیا ہے، پھر ان کو مظاہر قدرت مین سے اونٹ، آسمان، پہاڑ، اور زمین کی طرف توجہ دلائی ہے، بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے، کہ اس موقع پر ان چیزون کا تعلق جزاے اعمال یعنی حشر و نشر اور دوزخ و جنت ہی سے ہوگا، لیکن خواجہ صاحب کے نزدیک اس درس عبرت سے ایک خادم قوم کو اونٹ سے سادگی، اور زہد و قناعت آسمان سے بلندی مقصد پہاڑ سے استقلال اور زمین سے فروتنی و خاکساری سیکھنی چاہیے، لیکن ہم نہین سمجھ سکتے کہ اس صورت مین اس آیت کو جزاے اعمال اور حشر و نشر سے کیا تعلق ہوگا؟ پھر وہ اسی پر اکتفا نہین کرتے بلکہ ان کے نزدیک اس آیت مین خدا نے اونٹ کی مثال سے علم الحیوانات اور آسمان کی مثال سے علم ہیئت، اور پہاڑ کی مثال سے علم جبال، اور زمین کی مثال سے علم طبقات الارض کے سیکھنے کی ترغیب دی ہے، لیکن اولاً تو ہم یہ نہین سمجھ سکتے کہ علم جبال کونسا علم ہے؟ دوسرے مفسر قرآن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مقاصد قرآن سے ناآشنا نہ ہو، اور ہم کو خواجہ صاحب

کی نسبت یہ حسن ظن ضرور ہے کہ وہ اس سے واقف ہون گے کہ قرآن مجید کا مقصد علوم و فنون کی ترغیب و تعلیم نہین ہے،

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک مقصد کے متعلق قرآن مجید کی اکثر آیتون کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہین اگرچہ قرآن مجید کی فہرستون نے اس کام کو بہت آسان کر دیا ہے، تاہم اس طریقہ سے قرآن مجید کے مطالب و مقاصد کے سمجھنے مین بہت آسانی ہو جاتی ہے،

بہر حال اگرچہ اس تفسیر کا انداز ہمارے نقطۂ نظر سے مختلف ہے اور اس سے اصل تفسیری ضرورت پوری نہین ہوتی، لیکن قرآن مجید کی آواز جس لب و لہجہ مین بھی پہونچائی جائے، وہ مفید ہے، اور اس حیثیت سے ہم خواجہ صاحب کی مساعی جمیلہ کے شکر گذار ہین،

"ع"

مطبوعاتِ جدیدہ

گنجینۂ سلیمانی | **چمنستانِ مظفر** } جناب مولوی مظفر حسین خاں صاحب سلیمانی، پتہ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڈھ،

ہردوئی کا ضلع اپنے بعض مردم خیز تاریخی قصبات کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز و مشہور رہا ہے، بلگرام اسی ضلع میں واقع ہے، اور شاہ آباد جس کے دو ممتاز بزرگوں کے حالات ان دو کتابوں میں ہیں، اسی علاقہ سے متعلق ہے، ان کتابوں کے مصنف بھی اسی موخر الذکر قصبہ کے لائق فرزند ہیں، ان دونوں کتابوں میں دو بھائیوں کے حالات ہیں، جنہیں سے ایک نے ہندوستان میں اور دوسرے نے ہندوستان سے لیکر انگلستان تک شہرت ناموری اور عزت حاصل کی،

گنجینۂ سلیمانی، ص ۲۹۰، قیمت عہ، اس کتاب میں ریاست بھوپال کے قدیم مشہور طبیب جناب حکیم سید فرزند علی صاحب کے حالات ہیں، اور چونکہ وہ تقریباً ۴۰ سال تک اس دربار سے وابستہ رہے، اس لئے اس ضمن میں اس ریاست کے حالات خصوصاً اور تمام ہندوستان کے علمی و سیاسی واقعات عموماً زیر بحث آگئے ہیں، اس کے ساتھ ہی حواشی میں متعدد بزرگوں کے حالات درج کئے گئے ہیں، وہ بھی بہت مفید ہیں، لائق مصنف کو صاحب سوانح کے ساتھ رہنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے اس لئے وہ جو کچھ لکھتے ہیں، ذاتی واقفیت کی بنا پر لکھتے ہیں، اسی سلسلہ میں ان کو دوسرے مشاہیر وقت سے بھی شرف ملازمت حاصل ہوا ہے، اور بقول جناب طباطبائی صاحب، وہ حالات مشاہیر کی زندہ تاریخیں ہیں،

چمنستانِ مظفر، ص ۴۴، قیمت ۱۲، ہیر اولاد علی صاحب، پہلے مسلمان ہیں جنکو انگلستان کے کسی جامعہ میں استاذی کا موقع ملا، ابتداءً وہ نواب واجد علی شاہ کے بھائی جرنیل صاحب، کے ملازم تھے، اور شاہی مرافعہ کے سلسلہ میں ان کے ساتھ ہی ولایت گئے، پھر وہیں کے ہو رہے وہیں شادی بھی کر لی تھی، تاہم وطن سے ان کا تعلق قائم تھا، ان کی نصف زندگی ایک بڑی حد تک حکومت اودھ سے متعلق تھی، اور اسی لئے ان کے حالات کے سلسلہ میں اودھ کے حالات کا تذکرہ ناگزیر

ہو گیا ہے، مصنف کو ان کے حالات کے لئے جو بہترین مواد ملا وہ وہ کاغذات و اخبارات تھے جو وکیل شاہ اودھ مولوی مسیح الدین خاں لندن سے اپنے ہمراہ لائے تھے، لیکن ہمکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولوی صاحب کی خود نوشتہ سوانح عمری میں ان کردہ واقعات اور زیر تنقید کتاب کے بعض بیانات میں بین فرق ہے، مثلاً ان ہیروں کی قیمت جو سمندر میں گر گئے ہمارے مصنف کے نزدیک ایک کروڑ ہے، لیکن مولوی مسیح الدین کا بیان ہے کہ وہ تین لاکھ روپیہ سے زیادہ کے نہ تھے، کم کا احتمال ہے" (دیکھو صفیر اودھ ص ۹۵)

بہرحال دونوں کتابیں عہد غدر اور اس کے بعد کے حالات کے لئے مفید اور قابل مطالعہ ہیں،

مدارج العربیہ، از مولانا محمد عزت اللہ صاحب الالہ آبادی، ص ۳۰، قیمت ۲، پتہ مصنف، مدرسہ حشمتیہ رحمت انجاز پور عربی سیکھنے والے طلبہ کے لئے عربی قواعد سے متعلق متعدد رسائل اردو میں شائع ہو چکے ہیں، اس رسالہ کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے، اس میں صرف و نحو دونوں کے قواعد مع مثال و مشق مختصر طریقہ سے دیئے گئے ہیں، اگر ایک لڑکا ذہین اور بتانے والا تجربہ کار ہو تو یقیناً پھر مزید کتابوں کی ضرورت نہ رہے، عربی الفاظ کے ساتھ اگر معنی بھی لکھدیے جاتے تو زیادہ بہتر تھا، مثالوں میں اکثر قرآن مجید کی آیتوں سے کام لیا گیا ہے، خدا کرے مولوی صاحب کی یہ سعی مشکور ہو،

انتخاب نقیب، ص ۴۸، قیمت ۸، الناظر بک ایجنسی لکھنؤ،

آج سے تقریباً ۱۲ سال پہلے بدایوں سے نقیب نکلا تھا، اور بہت جلد اپنے مضمون نگاروں کی وجہ سے ادبی دنیا میں مقبول ہو گیا تھا، انہیں مضمون نگاروں میں خود بدایوں کے ظریف انشا پرداز ملا یوسف ماسوی بھی تھے، ہمدرد کی مجلس تجاہل عارفانہ کے روح رواں آپ ہی تھے، الناظر میں بھی مختلف اوقات میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، جناب ظفر الملک صاحب ایڈیٹر الناظر نے اس خوف سے کہ نقیب کی موت کے بعد یہ دلچسپ مضامین بھی فنا نہ ہو جائیں، ان کو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، "بدایونی ملا کے "پیڑوں" کا جن اصحاب کو مزا ل چکا ہے، وہ یقیناً اس نئے دستر خوان سے اپنے کام و دہن کو لذت آشنا کرنے میں دریغ نہ کریں گے"

فطرتِ اطفال، مترجمہ جناب حامد حسن صاحب قادری، ص ۷۴، قیمت ۴ر، پتہ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ،

ادھر چند سال سے مسلمانوں میں نفس طریقۂ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم پر غور کرنے کا خیال پیدا ہو گیا ہے، اور ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے فرض کا احساس کرتے ہوئے اسمیں ان کی رہنمائی شروع کر دی ہے، چنانچہ تربیۃ الاستقلالیہ تعلیم و تربیت وغیرہ کی اشاعت اسی کی زندہ دلیلیں ہیں، زیر تنقید کتاب بچوں کی فطرت سے متعلق ہے، یہ دراصل ایک انگریزی رسالہ مصنفہ ڈاکٹر بچین ڈی لارسن کی کتاب "بچوں کی عملی تربیت" کا ترجمہ ہے، جناب حامد حسن صاحب قادری درسی کتابوں کے ترجمہ میں مہارت رکھتے ہیں، اور یہ ترجمہ بھی ان کے معیار کے مطابق ہے۔

اتالیق، مرتبہ سید مخدوم عالم صاحب مرحوم ص ۶۸، قیمت ۵ ر پتہ مذکورۂ بالا،

یہ ابتدائی رسالہ مسلمان بچوں میں عام معلومات کے ساتھ مذہبی واقفیت پیدا کرنے کے لئے لکھا گیا تھا، کہ اردو زبان کیساتھ ہی ساتھ مذہب سے متعلق بھی کچھ نہ کچھ باتیں معلوم ہوتی رہیں، اخلاق و تربیت حسنہ کے تخیل کے پیدا کرنے کا بھی اسمیں سامان کیا گیا ہے، چنانچہ انھیں تمام خوبیوں کو مدنظر رکھکر ایجوکیشنل کانفرنس نے اسے شائع کیا ہے، اور ہمکو امید ہے کہ مسلمان اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

پتھر سے ہیرا، از جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب، ص ۱۱۲ قیمت پتہ:- منیجر نظام المشائخ، پوسٹ بکس نمبر ۱۵، دہلی،

یہ ایک اخلاقی و تبلیغی اور تربیتی افسانہ ہے، جو اب سے کچھ عرصہ قبل تک نظام المشائخ میں باقساط شائع ہوتا رہا تھا، اور اب جناب خواجہ حسن نظامی صاحب کی فرمائش سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

"م - ن"